جملہ حقوق بحق مرتب محفوظ ہیں

اقبال اور قرآن

مرتبہ

ڈاکٹر عارف بٹالوی

بار اوّل
جون ۱۹۵۰ء

ہدیہ فی نسخہ پانچ روپے

کتاب ملیشڈ
رابسن روڈ کراچی

ڈاکٹر عارف بٹالوی

رُوحِ انتساب

حکیم العصر حضرت علامہ اقبالؒ کے نام

جس کی چیز اسی کی نذر !

عقیدت مند

عارف بٹالوی

موضوعات

۱ کلامِ اقبال و کلامِ خدا صفحہ ۱۱۹ تک

۲ اسلام میں زندگی کا تصور " ۲۰۸ تک

۳ قرآن اور خودی " ۳۲۰ تک

۴ اقبال اور کائنات " ۴۱۶ تک

کلام اقبال

و

کلام خدا

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

نفی کے ساتھ اثبات ، انکار کے ساتھ اقرار، بغاوت کے ساتھ اطاعت ، سرکشی کے ساتھ تسلیم ، تخریب کے ساتھ تعمیر، دُنیا بھر کے نظامہائے حیات سے بغاوت ، اور یہ سرکشی اس لئے نہیں کہ اِسے ضد یا تعصب ہے ، بلکہ اس حقیقت کے اعلان کے لئے کہ انسان ایسا نظام وضع ہی نہیں کرسکتا جو حضرتِ اِنسان کے عین مطابق ہو - یہ صرف خلاقِ فطرت ہی کرسکتا ہے۔

اِس حقیقت کا اعلان کہ اس کے سوا کسی میں شانِ ربوبیت نہیں - اِس کے سوا کوئی خالق نہیں - اِس کے سوا کوئی رب نہیں اِس کے سوا کسی میں کوئی قوت نہیں - رزق کے خزانوں کی چابیاں اِس کے سوا کسی کے ہاتھ میں نہیں - حکومت اس کے سوا کسی کو زیبا نہیں - اس کے سوا کسی کی محکومیت جائز نہیں۔

جب ایک مردِ مومن اپنے پُورے علم و یقین کے ساتھ، دل کی گہرائیوں سے اعلان کرتا ہے کہ :-

خودی کا سرِّ نہاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ
یہ دَور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ
کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا
فریبِ سُود و زیاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ
یہ مالِ و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ
خِرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زُنّاری
نہ ہے زماں نہ مکاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ
یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ
اگرچہ بُت ہیں جماعت کے آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ

شرک و اللہ

شانِ ربوبیت کا ارشاد ہے کہ

"جس کسی نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا تو اس کا حال ایسا سمجھو جیسا آسمان (کی بلندی) سے (زمین کی پستی پر) اچانک گر پڑا۔ جو چیز اس طرح گرے گی اسے یا تو کوئی اُچک لے گا یا ہوا کا جھونکا کسی دُور دراز گوشے میں لے جاکر پھینک دے گا۔"

(الحج ۲۲/۳۱)

جُھکنا ہے تو صرف اس ایک کے سامنے جس کے سامنے جھکنے کا حق ہے؛ طاعت ہے تو فقط اس ایک کی، جس کی اطاعت میں شرفِ انسانیت کا راز ہے۔ مظاہرِ فطرت میں سے کسی کے سامنے جُھکنا اپنی انسانیت سے انکار کرنا اور اپنے جیسے انسانوں میں سے کسی کے سامنے سرنگوں ہوجانا خودی کی انتہائی ذلت ہے:

ترا وجود سراپا تجلّیِ افرنگ
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر

مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے ہے خالی
فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر

شرک کو اِسی لئے ظلمِ عظیم کہا گیا ہے کہ اِس سے بڑھ کر بیجا بات کوئی نہیں ہے۔ یہ اپنی ہستی کا انکار اور اُن کی خدائی کا اقرار ہے جو زیادہ سے زیادہ اپنے جیسے انسان ہیں۔ جس نے شرفِ انسانیت اور خودیِ بلند جیسی متاعِ عزیز کو یوں دوسروں کی نذر کردیا تو اس کے بعد اور کونسی شئے باقی رہ سکتی ہے جسے بیچ ڈالنے میں اِسے کیسی قسم کا تامل ہو سکتا ہے؟ اللہ پر ایمان اور ہر غیر اللہ قوت سے انکار، یہ ہے رازِ زندگی، یہ ہے اصلِ حیات:۔

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا
وجود کیا ہے؟ فقط جوہرِ خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

اِلٰہ یعنی اقرار (ایمان) اور ایمان وہ جس کا سرچشمہ دل کا یقین اور جس کا مظہر نظامِ حیات ہو، نہ وہ جو محض زبان کی جنبش تک محدود ہو کر رہ جائے، اور زندگی اس کی عملی تکذیب کر رہی ہو، ایسے جسدِ بے روح کی کیا قیمت!

یہ عقل جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار
شریکِ شورشِ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

جب ثبات پر سرگردانیاں ایمان لے آئیں تو پھر ایک اور جستجو نے پریشان کیا، کہ یہ سب کس کی طرف سے ہے؟ اور یہ معلوم کرنے کے لئے کہ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے، اِس منتہی کی تلاش میں مدتوں دشت پیمائیاں اور صحرا نوردیاں کیں۔ لیکن تنہا ذہنِ انسان اِس منزل کا کہیں سُراغ نہ پا سکا۔ نہ یونان کی درسگاہوں میں، نہ ایران کے آتشکدوں میں، نہ ہندوستان کے یوگ استھانوں میں، نہ رُہبا کی خانقاہوں میں۔ جب کہیں وحیِ ربانی کے نغمۂ سرمدی کی کوئی آواز کان میں پڑ گئی، اس کی نگاہوں میں شادابی اور پیشانی پر نُور کے آثار چمک اُٹھے۔ لیکن جُوں ہی وہ گُم ہوئی پھر اُسی وادیِ حیرت میں کھو گیا۔ یہی ہوتا رہا، تا آنکہ اِن بکھرے ہوئے نغموں کی صدائیں ایک ایسے رباب جاں نواز میں سمٹ کر آگئیں، جس نے اپنے ترنّم لاہوتی کی پُوری دلکشی سے فضائے عالم کو اِس نغمۂ جاں فزا سے منور کر دیا۔ لیکن افسوس

کہ آج کچھ مسلمان اپنی منزلوں سے الگ بھٹک کر غلط راہوں پر چلا جا رہا ہے۔ اور مظاہرِ کائنات کو اپنا رب تسلیم کرنے میں تامل نہیں کر رہا، حالانکہ یہ سب کچھ اسی کی خاطر چمکتے ہیں۔

مجھ کو بھی نظر آتی ہے یہ بوقلمونی
وہ چاند یہ تارا ہے وہ پھول یہ نگیں ہے
دیتی ہے مری چشمِ بصیرت بھی یہ فتویٰ
وہ کوہ یہ دریا ہے وہ گردوں یہ زمیں ہے
حق بات کو لیکن میں چھپا کر نہیں رکھتا
تو ہے، تجھے جو کچھ نظر آتا ہے نہیں ہے

تصور، اور کسی بلند و بالا ہستی کا تصور، کسی اپنے سے بڑی ذات کے وجود کا احساس۔ ایسی ذات کا تخیل جس کی عبودیت اختیار کی جائے، جس کے سامنے جھکا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ احساس فطرتِ انسان کا احساس ہے، تو اس احساس کا پیدا کردہ تصور بھی خالقِ فطرت کا تصور ہونا چاہیئے۔ لیکن جس طرح گوناگوں اسباب و اثرات فطرتِ انسانی پر مختلف قسم کے پردے ڈال کر اسے کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں۔ اسی طرح اللہ کا یہ فطری تصور بھی مختلف قسم کے عناصر میں گم ہو کر کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض

وقت یہ فطرت کچھ اس انداز سے ان پردوں میں چھپ جاتی ہے
دیکھنا تو کجا اس کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی، یہاں آکر انسان کی
فکر ان خارجی پردوں سے ٹکرا کر ذاتِ حقیقی سے منکر ہو جاتی ہے

بدلتے ہیں کہ بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں
اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات
یہ ایک معجزہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

تحت الثریٰ کی آتش فشانیاں، اوجِ ثریا کی ظلمت آفرینیاں، دریاؤں
کی دہشت خیز روانیاں، ہواؤں کی تند و تیز جولانیاں، صحراؤں کی بربریت
زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے، جب ہاتھ باندھے عبادتِ
حق کے حضور میں کھڑے ہیں، جب صورتاً ہی تو مومن ان کا
خادم ہو تو کیونکر ان کی اطاعت، ان کے سامنے جھکنا اور انکے
لئے بنانا کیا معنی! لا کے معنی ہیں کہ ہر غیر اللہ وجود سے بغاوت
کرنی اور انکار۔ جب اس انکار سے ذہن کی زمین ہموار ہو جائے
تو پھر الا یعنی صدق وجودِ الٰہی کی عمارت کی بنیاد رکھی جائے۔ تمام
قوتوں کو رستے سے ہٹا کر صرف ایک قوت (خدا) سے بندے
کو براہ راست تعلق پیدا کر دینا قرآن کریم کی بنیادی تعلیم ہے۔ لیکن

وائے افسوس کہ آج مسلمان پھر انہی خداؤں سے پیوست ہو رہا ہے
جنھیں مٹا دینے کے لئے لا کی تعلیم دی گئی اور اِلّا کے ابدی
قانون کو پیش نہیں کیا گیا:

وہی ہے بندۂ حُر جس کی ضرب ہے کاری
نہ وہ کہ حربہ ہے جس کی تمام عیّاری
انہیں سے فطرتِ احرار میں ہیں دوش بدوش
تلنگری و قبا پوشی و کلہ داری
زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے
انھیں کی خاک میں پوشیدہ ہے وہ چنگاری
وجود انھیں کا طواغیتِ جہاں سے ہے آزاد
یہ تیرے مومن و کافر تمام زنّاری

مادہ پرست

شرک کرنے والوں میں سے ایک گروہ وہ ہے جو مادہ کو قدیم مانتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ بات محال ہے کہ کوئی چیز عدم سے وجود میں آجائے۔ یعنی پہلے بالکل نہ ہو پھر پیدا ہو جائے۔ اس لئے ان کا خیال ہے کہ مادہ کائنات میں خدا کی طرح قدیم ہے۔ فطرت کی نیرنگیاں صرف مادہ کے تغیرات کا نام ہیں۔ بیج سے درخت پیدا ہوتا ہے درخت سے بیج۔ اس قسم کی غلط فہمیوں کی بنیاد یہ ہے کہ انسان خدا کو بھی اپنے جیسا ایک سمجھ لیتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ انسان کی قدرت سے باہر ہے کہ کسی شئے کو عدم سے وجود میں لے آئے۔ لہٰذا یہ عقیدہ قائم کر لیا کہ روح۔ مادہ اور خدا تینوں ازلی اور ابدی ہیں۔ ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ اس جماعت کے نزدیک مادہ کے بغیر خدا بھی ایسا ہی عاجز ہے نعوذ باللہ جیسا کہ مصور بغیر رنگوں کے۔ اس کی تردید میں قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔

وہ آسمانوں کا اور زمین کا موجد ہے۔ اس کے واسطے کیسے ہو سکتی ہے جبکہ اس کی کوئی بیوی تھی نہیں۔ اور اس نے

ہر شئے کو پیدا کیا ہے، اور اُسے ہر شئے کا علم ہے۔ یہ ہے تمہارا رب، اس کے سوا کوئی خدا نہیں، ہر شئے کا پیدا کرنے والا، پس اُس کی عبودیت اختیار کرو اور وہ ہر چیز کا کارساز ہے، اس کو کسی کی نگاہ نہیں پا سکتی، لیکن وہ سب نگاہوں کو پا رہا ہے۔ اور وہ بڑا باریک بیں اور باخبر ہے۔" الخبیر (۱۰۲-۱۰۴)

لیکن انسانوں نے اِس خدائے واحد کو چاند سورج ستاروں اور مادہ چیزوں میں دیکھنا چاہا، مگر وہ مردِ مومن جس نے قرآن کی تحقیق سے اِن تمام بلندیوں پر کمندیں ڈال دیں اور اِن تمام اشیاء کو احاطۂ علم میں محدود و اسیر کر لیا اور انھیں مجبور کیا کہ اس کی خدمت میں خادم بن کر رہیں۔

کل ساحلِ دریا پہ کہا مجھ سے خضر نے
تو ڈھونڈ رہا ہے مے افرنگ کا تریاق؟
اِک نکتہ مرے پاس ہے شمشیر کی مانند
برندہ و صیقل زدہ و روشن و برّاق
کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اُس میں ہیں آفاق

قرآن کریم میں ارشاد ہے:-

"وہ کون ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا، اور تمہارے لئے بلندی سے پانی برسایا، اور پھر اس پانی کے ذریعہ ہم نے رونق دار باغات اُگائے۔ تم سے تو ممکن نہ تھا کہ ان باغات کے درختوں کو اُگا سکو۔ تو کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی الٰہ ہے؟ مگر یہ لوگ ہیں کہ اس پر بھی راہ راست سے پھرے جاتے ہیں۔ وہ کون ہے جس نے زمین کو قرارگاہ بنایا، اور اس کے اندر نہریں چلا دیں، اس کے لئے پہاڑ کھڑے کر دیئے، اور دو دریاؤں (یا سمندروں) کے درمیان حد فاصل ٹھہرا دی۔ تو کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی الٰہ ہے؟ لیکن ان میں سے اکثر اس حقیقت کو نہیں جانتے کہ کون ہے جو قلب مضطر کی دعاؤں کو سنتا ہے جب وہ اُسے پکارتا ہے اور اس کی مصیبت کو دور کر دیتا ہے۔ اس نے تمہیں دنیا میں بادشاہ یا جانشین بنایا۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور بھی معبود ہے؟ بہت تھوڑے ہیں جو نصیحت کی اس آواز کو یاد رکھتے ہیں۔ وہ کون ہے جو خشکی اور بحر کی تاریکیوں میں تمہاری رہنمائی کرتا ہے۔ جو اپنی رحمت سے پہلے بھیجتا ہے کہ ان مژدہ جانفزا سے اس کے رحمت کی خبریں دیں۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور بھی ہے؟ اللہ ان لوگوں کے شرک سے بلند ہے۔"

جس نے مخلوق کو پہلی بار پیدا کیا اور پھر اس کو دوبارہ زندہ کرے گا، اور وہ کون ہے جو تمہیں پستیوں اور بلندیوں سے رزق بہم پہونچاتا ہے، آسمان سے پانی اور زمین سے سبزہ دے۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور بھی معبود ہے؟ کہو کہ اگر تم اپنے دعوئے شرک میں سچے ہو تو اس کے لئے کوئی دلیل پیش کرو۔ (۲۷-۶۰:۶۲)

رب العالمین، کسی خاص قبیلہ۔ خاص قوم۔ خاص ملک کا خدا نہیں تمام کائنات کا خدا ہے۔ ہر ایک کا اِلٰہ ہے۔ سب تعریفیں اُسی کے لئے ہیں۔ جب تمام صفات کا مرکز اسی کی ذات ہے تو تعریفیں بھی اُسی کے لئے ہیں۔ ان باتوں میں کوئی اُس کا شریک نہیں۔ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ۔ ایک واحد اللہ۔ تمام قوتوں کے سرچشمہ کا مالک، جس نظام کے ماتحت سمندر کا کائنات چل رہا ہے اس نظام کا قادر و مختار۔ جب وہ قادر و مختار ہے تو پھر ساری کائنات پر حکومت بھی اُسی کی ہو سکتی ہے۔ لیکن ہمارے زمانہ کی مخلوق اللہ کی محبت کی اسیری سے نکل کر اپنے بنائے ہوئے زنداں میں اسیر ہے:

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
خاور کے تو ابت ہوں کہ افرنگ کے معمار

پیرانِ کلیسا ہوں کہ شیخانِ حرم ہوں
نے جدتِ گفتار ہے نے جدتِ کردار
ہیں اہلِ سیاست کے وہی کہنہ خم و پیچ
شاعر اِسی افلاس تخیل میں گرفتار

سب سے بڑا مسئلہ رزق کا ہے۔ حقیقی اللہ سے سرکشی اختیار کرنے کے بعد انسان سمجھتا ہے کہ میرا رزق فلاں انسان یا قوت کے ہاتھ میں ہے، چنانچہ وہ اُس قوت کے روبرو سر جھکانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن نے غیر الٰہی قوتوں کے علاوہ کسی دیگر قوت کے سامنے جھکنے کی تعلیم نہیں دی بلکہ سختی سے روکا ہے کیونکہ یہی شرک و فساد کی جڑ ہے۔ قرآن رزق کے دروازوں کی کنجیاں انسانوں سے چھین کر خدا کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ اور یوں واضح کر دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں ہو سکتی جس کے سامنے جھکا جائے:

اے نوعِ انسانی تم پر جو اللہ کے احسانات ہیں ان کو یاد کرو، کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے جو تم کو زمین سے اور آسمانوں سے رزق پہنچاتا ہے۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے سو تم کہاں اُلٹے جا رہے ہو۔ (۳۵/۳)

فرعون نے اپنے دعوئ دلیل خدائی کے ثبوت میں یہی تقریر پیش کی تھی :-

اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (۷۹/۲۴) میں تمہارا سب سے بڑا پرورش کرنیوالا ہوں۔

رازق بننے میں یہی باطل دعوی سرکش قوتوں کے دماغ میں خالق کا خناس پیدا کردیتا ہے۔ حالانکہ حقیقی رزاق وہی ہے۔ حکومت وسلطنت اُسی ایک ذات کو زیبا ہے جسے اللہ واحد کہتے ہیں۔ انسانوں کو حکومت اس لیئے دی جاتی ہے کہ وہ اپنے اللہ سے تعاون کرکے اُس کے قوانین کے ماتحت نظامِ کائنات کے توازن کو قائم رکھیں۔ اللہ کی وحدانیت کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں ہے، بشرطیکہ پہلے لا کے تصور سے ذہن کی زمین ہموار کرلی جائے اور پھر اِلّا کے تصور کی عمارت کی بنیاد رکھی جائے۔

نہ ہو اس میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیئے
نہ ہو ذوقِ شوق کہ پوشیدہ لا الٰہ میں ہے
ترا شیخ فقیہ نہ ہو تو کیا کہیئے
سرور جو حق و باطل کی کارزار میں ہے
تو سرب و ضرب سے بیگانہ ہو تو کیا کہیئے

جہاں میں بندۂ حُر کے مشاہدات ہیں کیا؟
تری نگاہِ غلامانہ ہو تو کیا کہیے
مقامِ فقر سے کتنا بلند ہے شاہی
رہے شہنشہِ کسریٰ کا گدایانہ ہو تو کیا کہیے

دنیا نے جن اغراض و مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر اپنے لئے الگ الگ معبود تجویز کئے، قرآن ان تمام صفات کو ایک ذاتِ واحد میں جمع کر دیتا ہے۔ اس اللہ واحد کا تعارف قرآن کریم نے اُس وقت کرایا جب دنیا میں کہیں اس کا صحیح نشان نہیں تھا۔ اور یہ اس لئے کہ قرآن کریم خود اس اللہ کی طرف سے دنیا کو دیا ہے کسی انسانی ذہن کی پیداوار نہیں ہے۔

"پس یقین رکھو کہ یہ قرآن علمِ الٰہی کے ساتھ نازل کیا گیا ہے، اور یہ کہ اس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں۔ تو کیا تم سر تسلیم خم نہیں کرو گے؟" (۱۱/۱۴) ۵

اس تسلیم کو نوعِ انسانی تک پہنچانا اور اس کے ذریعہ سے فطرتِ خوابیدہ کو بیدار کرنا قرآن کا مسلک ہے۔ اس پیغام کو کائنات تک پہنچانے کے لئے اللہ اپنے فرشتوں سے کام لیتا ہے، اور انسانوں میں سے جس انسان پر چاہتا ہے نازل

کرتا ہے۔ یہی وہ انسان ہیں جنھیں مومن کہا گیا ہے، مومن کون ہیں؟

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
فطرت کا سرودِ ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمان

مذہب نہ ہو یا تعصب (نعوذ باللہ) شانِ کبریائی میں داخل نہیں ہے۔ اللہ نے انسانوں کو ایک اللہ کی دعوت اس لئے نہیں دی

کہ وہ اقوامِ دیگر کے خداؤں کی پرستش ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا، بلکہ اس لئے کہ اِلٰہ صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔

"اور زمین و آسمان میں اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ بھی ہوتا تو یہ ارض و سما (سلسلۂ کائنات) درہم و برہم ہو جاتا۔ سو اللہ کائنات، جہانبانی کے تخت کا مالک اور ان باتوں سے پاک ہے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں۔" (۲۱/۲۳)

یہ ہوش ربا کارخانہ اس عمدگی نظم و نسق کے ساتھ چل ہی نہیں سکتا جب تک کہ اس کا سارا انتظام صرف ایک قوت کے ہاتھ میں نہ ہو۔ اس کے برعکس دو قوتوں کے مختلف ارادوں کے ماتحت یہ نظامِ عالم ایک لمحہ کے لئے بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ دو عملی نظامِ کائنات کو درہم و برہم کر کے رکھ دے۔ اس کا لازمی نتیجہ فساد ہے۔ لیکن جس نظام کی کڑیاں ٹھیک حالت میں سرگرمِ عمل رہیں اس کا نظام اعتدال پر ہوتا ہے۔ ایک انجن کے دو ڈرائیور ہوں تو وہ ایک سمت کی طرف نہیں جا سکتا۔ دو مختلف ارادے اُسے دو مختلف راہوں کی طرف اپنی اپنی منشاء کے مطابق لے جانا چاہیں گے، نتیجہ ان کی شکست ہے:۔

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

یہ مختلف خداؤں کا تصور، خواہ برہمن کے دیوی دیوتاؤں یا اس کی قوتوں کے مختلف مظاہر جو بیشتر شو، وشنو وغیرہ۔ ذہن انسانی کے عہد طفولیت کی یادگار ہے۔ جب یہ سمجھا جاتا تھا کہ نظام کائنات کے مختلف شعبوں میں کوئی اجزا اجزا نہیں بلکہ خود الگ الگ کام کرتے ہیں۔ ہوائیں ایک الگ قانون کے ماتحت چلتی ہیں۔ اور اس کے خدا کا نام وآ دیوتا ہے۔ اور بارش اندر دیوتا کے ماتحت ایک محکمہ کے ماتحت کام کرتی ہے۔ پیدائش، زندگی، موت ہر ایک شعبہ کے لئے الگ الگ دیوتا کی ضرورت ہے۔ لیکن عقل انسانی (سائنس) نے اپنی بلوغت کو پہنچکر مشاہدات و تجربات سے جب کائنات میں یہ کیفیت دیکھی کہ

لو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

تو مختلف خداؤں کا عقیدہ پاش پاش ہو کر رہ گیا۔ آج بھی انسان کی تمدنی عمرانی اور معاشرتی زندگی کو دیکھا جائے تو وہاں بھی متعدد خداؤں کے عقیدہ سے جو فساد رونما ہوتے ہیں۔ وہ [illegible] کی بدترین مثال ہے۔ یہ تمام فتنہ و فساد اور

بے اطمینان و فقدانِ سکون کی آگ اس لئے بھڑک رہی ہے کہ انسانوں نے الگ الگ معبود تراش رکھے ہیں۔

کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز گرمیِ محفل نہ کر قبول

لا کے بعد مختلف معبودوں کی جگہ ایک الٰہ حقیقی پیدا کر کے دیکھئے کہ یہ تمام فساد ختم ہو جاتا ہے یا نہیں۔ فساد تو اس لئے ہے کہ ایک سے زیادہ ذہنِ انسانی نے الٰہ تجویز کر رکھے ہیں۔ ایک قوم کا الٰہ دوسری قوم کو جینے نہیں دیتا۔ ایک ملک کا خدا دوسرے ملک والوں کو ایٹم بم کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ ہر فرقہ کا الٰہ اپنے بندوں کو لے کر دوسروں پر چڑھائی کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ ہر جگہ فساد ہی فساد ہے اعتدال کا کہیں نام ہی نہیں ہے۔ دوسرے تو دوسرے خود مسلمان کا یہ حال ہے کہ ایک الٰہ پر ایمان رکھتے ہیں بے ایمانی کا ثبوت پیش کر رہا ہے۔ اور مختلف جماعتیں بنکر تحت الشعور کی پرستش میں مصروف ہیں:۔

ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے
حریتِ افکار کی نعمت ہے خداداد

چاہے تو کرے کعبے کو آتش کدۂ پارس
چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد
قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد

شرک کی حقیقت انسان پر اُس وقت کھلتی ہے جب وہ اپنی عظمت اور جوہرِ ذاتی کی قیمت سے واقف ہو جاتا ہے، اُس وقت اُسے معلوم ہوتا ہے کہ ان حقیر چیزوں کو خدا بنا کر اُس نے اپنے آپ کو کس قدر ذلیل بنا رکھا تھا، اسی لئے فرمایا کہ

"خدا کے ساتھ کوئی دوسرا معبود تجویز نہ کرو ورنہ ایسے ہو رہو گے کہ ہر طرف سے نفرین کے مستحق اور ہر طرف سے درماندگی میں پڑے ہوئے۔" (۵ ۲۳/۱۷)

سورۂ شعراء میں ہے:۔

"اور اللہ کے ساتھ دوسرا معبود مت پکارو ورنہ تو ان میں سے ہو جائے گا جو عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں۔" (۵ ۲۶/۲۱۳)

خدا کے بندے کبھی کسی دوسرے کے سامنے نہیں جھکتے۔ بیشک اپنی عظمت سے آگاہ ہو کر دیکھ لیجئے۔

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے
افلاک منور ہوں ترے نورِ سحر سے
خورشید کرے کسبِ ضیا تیرے شرر سے
ظاہر تری تقدیر ہو سیمائے قمر سے
دریا متلاطم ہوں تری موجِ گہر سے
شرمندہ ہو فطرت ترے اعجازِ ہنر سے
غیبا کے افکار و تخیل کی گرائی
کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی

صنم پرستی کے علاوہ شرک کے مظاہرے کی اور صورتیں بھی ہیں۔ مجوسی دو مختلف خدا مانتے ہیں، اور ان دونوں خداؤں کو مستقل مانتے ہیں۔ ایک نیکی کا خدا اور دوسرا بدی کا۔ ایک نور کا خدا اور دوسرا ظلمت کا۔ قرآن کریم نے اس عقیدہ کی بھی تردید فرمائی ہے:-

"اللہ نے کہا کہ دو معبود اپنے لئے نہ بناؤ۔ معبود ایک ہی ہے۔ سو تم لوگ خالص مجھ سے ہی ڈرو۔ (۱۶/۵۱)

دیکھا جائے تو یہ انسان کے اپنے ذہنی تصورات کا آئینہ ہے۔ یہی زاویہ نگاہ کی نادرستی کی بیّن دلیل ہے ورنہ زاویہ نگاہ درست

ہو جائے تو معلوم ہو جائے کہ

میرے ساقی نے خدا کی ہے مئے بے درد عطا
رنگ جو دیکھتے ہو تم میرے پیمانے کا

عیسائی فرقہ تین خدا مانتا ہے۔ باپ۔ بیٹا اور روح القدس اور یہ عقیدہ بھی باطل ہے:

"بلاشبہ اُن لوگوں نے دین میں کفر کیا جنھوں نے کہا کہ خدا تین ہیں، حالانکہ بجز اس ایک معبود کے اور کوئی معبود نہیں۔"

(۵/۷۳)

اہل کتاب نے مذہبی احبار و رہبان۔ علماء و مشائخ کو خدا کا شریک بنا لیا تھا۔ یہ عقیدہ انسانی عظمت و تقدس کا نقاب اوڑھ کر عقیدت مندوں کے راستے قلب و ذہن میں سرایت کرتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا، اس پر خدا نے فرمایا:

"انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر علماء مشائخ کو خدا بنا لیا، اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ ان کو حکم یہی دیا گیا تھا کہ وہ صرف ایک الٰہ کی پرستش کریں، جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ ان کے شرک سے پاک ہے۔"

(۹/۳۱)

پھر ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے نظریہ

عقیدہ کے مطابق ہر غالب قوت کو خدا مان لیا اور یہ تمام شیطانی طلسم تھا۔ ابلیسی نظام تھا، اور آج بھی:

تری حریف ہے یا رب سیاستِ افرنگ
گری ہے اس کے پجاری پہ فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے
بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

زندگی بخشنے والا، پرورش کرنے والا، رزق دینے والا، امن و سلامتی عطا فرمانے والا، ہر وقت نگہبان، بگڑی بنانے والا۔ ہر معاملہ میں کارساز، وہ جس پر کامل بھروسہ کیا جا سکے، جسے مایوسیوں میں پکارا، یا سب جس کے قبضہ میں نفع و نقصان ہے، جو حاضر و غائب کا علم رکھتا ہے، سب پر غالب، عظمتوں کا مالک، ہر عیب سے منزہ، ملک الملک، شہنشاہِ حقیقی، جس کی زندگی کے لئے فنا نہ ہو، جس کے قیام کو زوال نہ ہو، جو کسی کا محتاج نہ ہو، جس کے سب محتاج ہوں۔ کیا اس ہستی کے علاوہ اور کوئی قابل ہے کہ اس کی حاکمیت اختیار کی جائے؟ لیکن جب تک عقائد میں پختگی نہ آئے گی ہر آقا کا انکار، ہر قوت کی نفی اور صرف اللہ کی اطاعت ممکن نہیں ہے۔ عقائد کی پختگی بڑی

ضروری ہے :-

حکمتِ مشرق و مغرب نے سکھایا ہے مجھے
ایک نکتہ کہ غلاموں کے لئے ہے اکسیر
دین ہو فلسفہ ہو فقر ہو سلطانی ہو
ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر
حرف اس قوم کا بے نور عمل زار و زبوں
ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر

جب تک انسان کے سامنے کسی شئے کی مثال پیش نہ کی جائے اس کی سمجھ میں اُس اصل شئے کی ماہیت نہیں آ سکتی۔ اسی طرح غیر ایمان والوں کے سامنے جب تک اللہ کی کسی شئے نہ رکھی جائے، وہ اللہ کی ماہیت کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ لیکن اللہ بے مثال ہے، لہذا ہمارے پاس کوئی ایسی مثال نہیں ہے جس کے وجود کو اللہ کی حقیقت سمجھانے کے لئے پیش کیا جائے۔ اللہ کو مان لینا ہی (ایمان) ہے، کیونکہ قرآن کریم میں ہے:

"اس کی مثل کوئی شئے نہیں ہے۔" (۴۲)

اللہ تعالیٰ نے اپنی ذاتِ قدس کے متعلق قرآن کریم میں

ایک مثال بیان فرمائی ہے:

"اللہ آسمانوں کا اور زمین کا نور ہے۔ اُس کے نور کی مثال ایک طاق ہے جس میں ایک چراغ ہے۔ وہ چراغ ایک قندیل میں ہے، وہ قندیل ایسا ہے گویا چمکتا ہوا تارا۔ وہ چراغ ایک مبارک درخت زیتون (کے تیل) سے روشن کیا جاتا ہے جو نہ شرقی ہے نہ غربی۔ اس کا تیل ایسا ہے کہ آگ نہ بھی چھوئے تو بھی مدھم ہوتا ہے کہ روشن ہو جائے گا۔ نور علیٰ نور۔ اللہ جسے چاہتا ہے اپنے نور سے ہدایت دیتا ہے، اور اللہ لوگوں کے لئے یہ مثالیں بیان کرتا ہے، اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ (یہ طاق) ایسے گھروں میں ہے جن کی نسبت اللہ نے اجازت دے رکھی ہے کہ بلند کئے جائیں اور ان میں اللہ کا نام لیا جائے اور صبح و شام وہاں میں اللہ کی تسبیح بیان کیا کریں۔" (۲۴/۳۵-۳۶)

محسوسات کا خوگر انسان ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ ہر حقیقت ایسا ہی محسوس ہو جائے۔ یا کم از کم بیان کرنے والا اس انداز سے بیان کرے کہ ذہن میں ایک محسوس پیکر کا تصور منتقش ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض فلسفی تھوڑے کی وجہ سے انسان نے بت پرستی اختیار کی۔ چونکہ اسے تجسم کی ضرورت تھی اور وہ ان دیکھے خدا پر ایمان

کیسے لے آتا، بلکہ وہ تو اِس عقیدۂ ایمان کا مذاق اُڑاتا تھا اسلام چونکہ علم و بصیرت کا دین ہے اس لئے اُس نے وہ تمام دروازے بند کر دیئے جن کے راستے اِس قسم کی توہم پرستی ذہنِ انسانی میں داخل ہو سکتی تھی۔ اس نے خدا کے متعلق کوئی ایسی مثال پیش ہی نہیں کی جس سے کسی وجود یا محسوس پیکر کا تصور پیدا ہو۔ اسلام حقیقت کو صاف حقیقت رکھنا چاہتا ہے۔ ایسا مقدس مذہب آج پھر بُتوں میں اُلجھ کر رہ گیا ہے۔ وہ مومن اللہ نے جن کے سینوں کو طاق کہا وہ غیر کے آستانوں پر جبیں سائی کر رہے ہیں اور غیر میں خود کو اور خود میں غیر کو سما رہے ہیں:

جاں بھی گرو غیر، بدن بھی گرو غیر
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے
یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

بنی نوع انسان نے اپنے ذہنی ارتقاء کے مطابق اپنے اپنے خدا مقرر کر لیئے۔ اُنہوں نے خدا کا نام دیوتا رکھا اس لئے کہ وہ خدا کے تو منکر ہی تھے پھر خدا کو تسلیم کیا کر لیتے۔ کسی نے

سوچا کہ انسان کے دو ہاتھ ہیں تو دیوتا کے چار ہونے چاہئیں، لہٰذا انہوں نے اپنے دیوتا کے چار ہاتھ بنا دیئے۔ کسی نے سوچا کہ انسان کا ایک سر ہے تو دیوتا ضرور دس گنا دماغ رکھتا ہوگا، چنانچہ دیوتا کے دس سر بنا دیئے گئے۔ اس قیاس کے مطابق مختلف خیال کے مختلف فرقوں نے مختلف قسم کے دیوتا بنا کر پرستش گاہوں میں رکھ دیئے۔ اور یہ مسلمان جس کا صرف ایک خدا ایک قوم ایک ملت ایک پیٹ فارم اور ایک نصب العین تھا، بھی منقسم ہو کر رہ گیا۔ یہ بھی ملت سے کٹ کر قبیلوں میں تقسیم ہو گیا۔ اور اس سے اس کا وہ عقیدہ بھی بتوں میں شریک ہو گیا۔

یہ نکتہ خوب کھلا خیبر شاہ سوری کے لئے
کہ امتیازِ قبائل تمام تر خواری ہے
عزیز ہے انہیں نام وزیری و سدوزئی
ابھی یہ خلعتِ افغانیت سے ہیں عاری
نہ پارہ پارہ ہے کہسار کی مسلمانی
کہ ہر قبیلہ ہے اپنے بتوں کا زنّاری

رزق و ہجرت

سامانِ زیست کا دوسرا نام رزق ہے۔ جب یہ مخلوق پیدا کی گئی تو اُس کے خالق نے سامانِ زیست بھی پیدا کیا۔ جو کبھی آسمانوں سے بارش کی صورت میں نازل ہوتا ہے اور کبھی زمین سے اناج اور پھلوں کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ تمام نظامِ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اس کے سوا کسی اور کو اس پر کچھ اختیار حاصل نہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو رزق دیتا ہے اس لئے وہ کسی سے رزق کا خواہاں نہیں ہے۔

رزق کی اعلیٰ قسم وہ ہے جسے نعمت کی روٹی کہتے ہیں، حضرات انبیاء کرام کو ایسا ہی رزق عطا ہوتا تھا۔ یہ رزق اعمالِ صالح کے عوض میں ملتا ہے۔ اور چونکہ اعمالِ صالح میں ہجرت اور جہادِ فی سبیل اللہ کو بہت بلند مرتبہ حاصل ہے اس لئے مہاجرین کو مجاہدین کے لئے ایسا ہی رزق متعین ہے۔

چونکہ دنیا میں جبر و استبداد کا نظام اس حالت پر قائم ہے کہ ذرائع رزق کو اپنے ہاتھ میں لے لیا جائے۔ اس لئے قرآن کریم

نے وضاحت سے کہہ دیا کہ رزق سوائے اللہ کے کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اس کی تنگی اور کشادگی اسی کے قبضہ و اختیار میں ہے۔ البتہ تنگی اور فراخی میں انسان کے ایمان کی آزمائش ہوتی ہے۔ اگر نشۂ دولت میں بدمست ہو کر سرکشی پر اتر آیا تو اس کی صورت تباہی میں بدل جائے گی۔ اگرچہ بظاہر نظر یہی آتا ہے کہ صاحب دولت خوب پھولتے پھلتے رہتے ہیں، لیکن جس طرح ہر پودے کو پھل لانے کے لئے ایک مقررہ وقت درکار ہے اسی طرح ہر عمل کے نتیجہ خیز ہونے کے لئے بھی ایک میعاد کی ضرورت ہے۔ حصول رزق کے لئے کوشش اور جد و جہد ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی فضل خداوندی کا متمنی رہنا بھی لازمی ہے۔ اس لئے کہ انسان کوشش بار آور نہیں ہو سکتی جب تک کہ اللہ کا فضل شامل حال نہ ہو۔ آج دنیا اس لئے مصائب میں مبتلا ہے کہ اس نے خدا کی ہستی کو بالکل بھلا رکھا ہے۔ اور اس طرح ایسے نظام بنائے زندگی وضع کر رکھے ہیں جن کا نتیجہ عدم مساوات کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ نظام زر و سود کا نظام ہے، یہ روٹی ذلت کی روٹی ہے۔

لئے طائر لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اللہ اور مومن

عرش الٰہی کا قرآنی تصور یہ ہے کہ :-

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۔ ۵ (۲/۲۵۵)

"اس کا تخت آسمان و زمین کی وسعتوں پر چھایا ہوا ہے"

عرش کے معنی چھت ، اور کرسی کے ہیں لیکن جب اس لفظ کو اللہ کی طرف منسوب کیا جائے گا تو نہ اس کے معنی چھت کے ہوں گے اور نہ ہی کرسی کے ۔ کیونکہ یہ دونوں چیزیں وجود رکھتی ہیں اور وجود رکھنے والی چیز وجود رکھنے والے کے لئے ہوتی ہے جو کہ اللہ نور ہے اس لئے عرش و کرسی پر وجود ثابت نہیں ہوتا ، یہ بھی نور ہے اسی نور کی ہر جگہ حکومت ہے یہی نور ہر جگہ چھایا ہوا ہے یہی خدا کی قوت وجبروت ، اختیار و قبضہ اور حکومت و سطوت ہے جو ہر چیز کے تابع فرمان بندوں کی قوتیں بھی کسی حدود فرائض و قیود کی آشنا ہوں گی ۔ ضعف و ناتوانی ، بے کسی و بیچارگی ، محکومی و ماتحتی جنہوں کے پاس نہیں پھٹک سکتی ، وہ خود صاحب قوت ہیں ۔ وہ دنیا کے ناتوانوں کی پاسبانی کے کفیل ، زندگی

کے سرچشموں پر ان کا قبضہ ہوگا۔ ان کا تختِ حکومت ہر مقام پر بچھا ہوگا۔ اللہ کی شانِ جلال ان میں منعکس ہوگی۔ ایسے بندوں کی قوتوں کا کیا حساب:

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

دُعا و دَوا

دوا فطری طور پر مرض یا مریض پر صادق آتی ہے۔ تندرست آدمی کو کبھی کسی دوا کی حاجت نہیں ہوتی۔ اسی طرح ہر مریض قوم کو دوا کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، دوا مرض کا فطری علاج ہے لیکن دُعا نفسِ انسانی پر ایک مؤثر شئے ہے۔ دُعا سے ضمیرِ انسانی کو سہارا ملتا ہے۔ جب قضا کے سامنے دعا ناکام ہو جاتی ہے تو انسان کی نفسیاتی کیفیت میں ایک انقلاب آجاتا ہے جب وہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ مصیبت جو آنے والی ہے دُعا سے رُک نہیں رہی بلکہ بڑھتی چلی آرہی ہے تو پھر جذبہ و استقلال سے اس کے مقابلہ کے لئے مردانہ وار کھڑا ہو جاتا ہے۔ ٹھیک اس وقت انسانی کے بے لے عزم و استقلال کے جوہر چمک جاتے ہیں اور انسان کی نفسیاتی ہیئت اس انداز سے بدلتی ہے کہ اس وقت وہ دُعا کے تصور پر تبسم ریز ہوتا ہے۔

تیری دُعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

رازِ بقا

عقل ہمیشہ محسوسات پر حکم لگاتی ہے۔ اس کے سامنے زندگی صرف حیاتِ طبعی کا نام ہے۔ ہماری آنکھ دیکھتی ہے کہ ایک شخص بے حس و حرکت ہو گیا ہے، نبض بند ہو گئی ہے، عملِ تنفس ختم ہو گیا ہے، عقل نے فیصلہ کر دیا کہ وہ مر گیا، ختم ہو گیا۔ عقل اس سے آگے جا ہی نہیں سکتی۔ جیسے نگاہ ایک خاص حد سے آگے نظر نہیں کر سکتی۔ لیکن جب کسی آنکھ پر دوربین لگا دی جائے تو اس کی حدِ نگاہ بہت آگے بڑھ جاتی ہے۔ وہ دیکھ سکتی ہے کہ جس مقام پر عقل نے فنا کا حکم لگا دیا تھا وہ اس کی اپنی کم نگاہی تھی۔ انسانی زندگی طبعی موت سے ختم نہیں ہوتی یہ ایک جوئے رواں ہے۔ جو منزلوں سے گزر کر اوجھل ہونے کے بعد بھی چلتی رہتی ہے لہٰذا وہ عقل جس بقا اور ہمیشگی کی فکر میں رہتی ہے وہ محض طبعی زندگی تک محدود ہوتی ہے جس میں ابدیت بقا اور مداومت نہیں۔ اس کے برعکس قرآن حکیم (وحی آسمانی) اس زندگی کو طبعی زندگی سے آگے لے جاتی ہے اور حقیقی بقا کا سامان فراہم کرتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اس

بقا کے لئے طبعی زندگی کو جلد سے جلد ختم کر دینا ضروری ہوتا ہے
وحی آسمانی کی رُو سے طبعی زندگی کا تحفظ اور عزت و تکریم کے
ساتھ تحفظ نہایت ضروری ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ایسا وقت آجائے
جب ابدی زندگی کے لئے اس طبعی زندگی کو ختم کر دینا پڑے
تو اُس وقت عقل کبھی ایسا اقدام نہیں کرنے دے گی، اس لئے
کہ اس کا کام یہی ہے کہ انسان کی طبعی زندگی کی حفاظت کرے۔ اُس
وقت ایمان (عشق) آگے بڑھے گا اور حیاتِ طبعی کے محدود پردوں
کو اُلٹ کر دکھا دے گا کہ یہ جوئے رواں کہاں تک بڑھتے چلی
جا رہی ہے۔ یہ ہے حقیقی بقا کی خاطر اس طبعی زندگی تک کو بھی
قربان کرنے کا۔ بس یہ ہے فرق عقل و عشق (ایمان) میں اور
یہی ہے فریب، یہ ہے ذرا سی حقیقت:

نہیں، یہ بحثی یہ ہے کہ تم پیش آنکھوں سے ہی دیکھا کرتے ہو
(عشق) آخرت، چھوڑ، نیست ہو (بیگانہ ہو جاتے ہو) (۲۳/۷۵)

سلکِ حیات یہ ہے کہ عقل کو اُس کی حد سے آگے نہ
بڑھنے دیا جائے، اس کا منصب صرف طبعی زندگی کی حفاظت کے
لئے سامان فراہم کرنا ہے۔ پس اس میں اس سے پورا پورا کام لیا
جائے کہ طبعی زندگی اس سلسلۂ ارتقاء کی ایک کڑی ہے جس کی

کا مضبوط ہونا خود پوری زنجیر کی مضبوطی کی دلیل ہے۔ لیکن جب ابدی زندگی کا سوال سامنے آجائے اور یہ دیکھ جائے کہ اس کے لئے وہ سامان و اسباب جو عقل نے طبعی زندگی کے تحفظ کے لئے فراہم کر رکھے تھے قربان کر دینے پڑیں گے، اس وقت بغیر سوچے عشق کے فرمان کی تعمیل لازم ہے:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

تسخیر کائنات

"کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ نے کس طرح زمین کی تمام چیزیں تمہارے لئے مسخر کر دی ہیں۔ جہاز کو دیکھو کس طرح وہ اس کے حکم سے سمندر میں تیرتا چلا جاتا ہے۔ پھر اس نے کس طرح فضائی کرّوں کو تمہارے لئے رکھا ہے کہ وہ زمین پر نہ گرنے پائیں، مگر جب اس کا اذن ہو، بیشک، اللہ، انسانوں کے لئے بڑا رحیم ہے رؤف ہے۔" (۲۲/۶۵)

دنیا کے سائنس داں ایک عمر کی کاوش کے بعد اب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مریخ والوں سے سلسلۂ گفت و شنید پیدا کرنا ممکن ہے، لیکن قرآن نے بہت پہلے سے اعلان فرما دیا ہے کہ مریخ والوں سے بات کرنا تو ایک طرف تمام اجرام فلکی کو انسان کے لئے مسخر کر دیئے ہوئے ہیں۔ تبھی تو زمین نے ان لفظوں میں آدم کا استقبال کیا:

تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گلشن یہ جوئے شیر یہ فضائیں

یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں
تجھ میں ہیں نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ!

صرف دریا اور پہاڑ اور سورج اور چاند ہی نہیں بلکہ ارض و سمٰوٰت میں جو کچھ ہے سب انسان کے تابع فرمان ہے، بشرطیکہ اس میں غور و فکر کیا جائے۔

"اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے سمندر کو مسخر کر دیا تاکہ اس میں جہاز اُس کے حکم سے چلتے جائیں اور اس طرح تم رزق کی تلاش کرو، اور یوں اس کے سپاس گزار بندے بنو، اور ارض و سمٰوٰت میں جو کچھ ہے اس نے سب تمہارے لئے مسخر کر دیا۔ یقیناً اس میں غور و فکر کرنے والی قوم کے لئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔" ۱۳/۱۲ ۴۵

بلکہ اس سے بھی آگے ظاہر و باطن کی تمام نعمتیں، انفس و آفاق کی تمام قوتیں اس کے زیر حلقۂ کمند ہیں:

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
چشمہ ترا ہمتا ہے ترے خون جگر میں
اے پیکر گل کوشش پیہم کی جزا دیکھ!

دنیا میں جس قدر فساد اور خوں ریزیاں، ظلم و استبداد ہے سب کی وجہ یہ ہے کہ انسان نے اپنے علم و عقل کو سرکش و بیباک چھوڑ رکھا ہے، اور اسے اپنے سے بلند و بالا ہستی کے قوانین کے تابع و مطیع نہیں رکھا۔ اسی کا نام ابلیسی نظام ہے۔ جس میں ہر وہ شخص، جماعت یا قوم جو دوسرے کو فریب دے سکے۔ یعنی وہ جو دوسرے کے علم و عقل سے زیادہ علم و عقل رکھے اور اُسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا جانے نہایت کامیاب ہے۔ علم کو جب وحیِ الٰہی کے ساحلوں میں محدود نہ رکھا جائے، تو یہ ایک ایسا پُرشور دریا بن جاتا ہے۔ جس کی طغیانیوں کے سامنے عدل۔ انصاف۔ اخلاق تہذیب۔ تمدن۔ جڑ سے اکھڑ کر بہے چلے جاتے ہیں۔

اِس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

لادیں ہو تو ہے زہر ملا ماسے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

ابلیس سے نجات

ابلیس ازل سے ہے اور قیامت تک رہے گا، اس کا نظام موجود رہا ہے اور رہے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب اس کا نظام قیامت تک رہیگا تو پھر اس سے چھٹکارا کیونکر نصیب ہو سکتا ہے؟ مشرق کی رہبانیت نے اس کا علاج یہ سوچا کہ دردِ سر کی دوا یا علاج کی بجائے سر کو اُڑا دیا جائے۔ یعنی شرفِ انسانیت حاصل کرنے کی بجائے رہبانیت اختیار کی جائے۔ نہ اس نظام میں رہیں گے نہ اس کا خوف پیدا ہوگا۔ یعنی ترکِ دنیا سے دنیا کے فکر ختم ہو جائیں گے اور ساری کشمکش حیات سے چھٹی مل جائیں گی۔ مگر انھیں یہ معلوم نہیں کہ یہ اپنی شکست کا اعتراف ہے، ضعفِ خودی کی دلیل ہے۔ یہ انتہائی یاس اور نا اُمیدی کا مظاہرہ ہے جو ابلیس کا مقصود ہے۔ اگر فطرت کا مقصود بھی یہی ہوتا کہ انسان غاروں میں جا بیٹھیں تو کشمکشِ حیات کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس صورت میں تو خلافتِ ارضی کے لئے آدم سے بڑھکر فرشتے زیادہ موزوں تھے۔ یہی مقصد

نے سوچا ہی نہیں کہ خودی کے عروج و ارتقا کے لئے کش مکش حیات جیسی قوتوں سے مقابلہ کس قدر ضروری ہے۔ یہ مقام عین فطرت کے مطابق ہے:

ہے گرمیِ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سورج بھی تماشائی تارے بھی تماشائی

یاد دہانی

"اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ (۷۳/۱۹) یقیناً یہ قرآن ایک تذکرہ ہے۔

کسی بھولی ہوئی بات کو یاد دلا دینا تذکیر کہلاتا ہے۔ یہ بات جس کی یاد دہانی کرادی جاتی ہے کوئی نئی نہیں ہوتی بلکہ ذہن کے کسی گوشہ میں چھپ کر بیٹھی ہوتی ہے۔ بھول کا ایک ایسا پردہ اس کے درمیان حائل ہوتا ہے کہ یادداشت کی نگاہ اُس تک نہیں پہنچتی۔ جونہی یاد دہانی کے زور سے وہ پردہ اُٹھا دیا جاتا ہے وہ بھولی ہوئی بات نمایاں طور پر سامنے آجاتی ہے۔ اسی شئے کا دوسرا نام وحی ہے اور وحی کسی پر ٹھونسی نہیں جاتی بلکہ یہ تو اُس کی فطرت کے بھولے ہوئے افسانوں کی یاد تازہ کراتی ہے جس سے گم گشتہ کہانی جنت نگاہ بن جاتی ہے۔ یہ وحی درحقیقت ہمارے ہی داعیاتِ نفسِ صالح کی ترجمان ہے؛

تُو بھی تیرا جبرئیل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجمان تیرا ہے یا میرا

اعلان

شیطان حق و صداقت کی راہ روکے کھڑا رہتا ہے۔ انسانوں کا وہ قافلہ جو شیطان کی متعین راہوں پر چلتا ہے وہ راہ کی گل کاریوں کے دل فریب مناظر سے متاثر ہو کر چلا جاتا ہے اور نہیں دیکھتا کہ ان نظر فریب وادیوں کے نیچے ہلاکت و بربادی کے کتنے بڑے ہولناک غار ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ دانشمند ہوتے ہیں، آنکھیں رکھتے ہیں، دیکھتے ہیں، لیکن آنکھیں تو اُس وقت کام دے سکتی ہیں جب فضا منور ہو، تاریکی میں آنکھیں کیا کام دیں گی۔ حضرت ہودؑ نے جب اپنی قوم سے کہا کہ

"اے میری قوم! میں تم پر بڑے دن کے عذاب سے ڈراتا ہوں۔" (۱۱/۲۶)

تو قوم کی طرف سے جواب ملا:۔

"خواہ تو ہمیں نصیحت کرے یا نصیحت کرنے والوں میں سے نہ بنے ہم پر سب برابر ہے، ہم تیری نصیحتوں سے کوئی اثر لینے والے نہیں، یہ تو ہمیشہ سے پرانے (خیالات کے) لوگوں کی عادت رہی ہے کہ وہ خواہ مخواہ لوگوں کو ڈراتے رہا کرتے ہیں، اور نہ

ہمیں کوئی عذاب دیا جائے گا۔" (۲۶/۱۳۶-۱۳۸)

وہ بار بار ایک ناصح امین کی طرح انھیں اُن کے اعمال کے انجام سے آگاہ کرتے تھے، لیکن وہ لوگ ہر بار یہی کہتے تھے کہ:

"اگر تم سچے ہو تو وہ بات لا دکھاؤ جس کا ہمیں خوف دلا رہے ہو۔" (۲۶/۲۲)

یہی حال اقوامِ مغرب کا ہے۔ جن کی دوربینیں مریخ تک کے احوال وکیفیات کا پتہ تو لے آتی ہیں لیکن تباہی و بربادی کا جو سیلاب اُن کے دروازوں سے ٹکرا رہا ہے وہ کسی کو نظر نہیں آتا۔ حالانکہ ایک ناصح امین اس مستقبل کا اعلان کر رہا ہے۔

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے تجھے
فرنگ رہگذرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

سعادت و نحوست

قرآن کریم نے اُس دن کو بہت منحوس کہا ہے جس دن کسی قوم پر اللہ کا عذاب طاری ہو:-

"ہم نے دنیاوی زندگی میں ذلت و رسوائی کا عذاب چکھانے کے لئے چند منحوس دنوں میں اُن پر ایک سخت آندھی بھیج دی، اور یہ تو کچھ بھی نہیں، بلکہ آخرت کا عذاب زیادہ رُسوا کُن ہوگا اور وہ وہاں کسی قسم کی مدد حاصل نہیں کر سکیں گے۔" (۵۴/۱۹)

اس سے معلوم ہوا کہ سعادت و نحوست کا تعلق آسمان کے ستاروں سے نہیں بلکہ جب کسی کے بُرے اعمال کے نتائج مرتب ہونے کا وقت آجائے۔ تو وہ گھڑی اس کے لئے منحوس ہے۔ لہٰذا وہ سعادت و نحوست خود انسان کے اچھے اعمال کے نتائج کا نام ہے، ستاروں کی گردش کا نام نہیں ہے۔ ستارے تو انسان کے تابع فرمان قرار دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ جو مسخر ہو وہ مقدرات کی تبدیلیوں پر کیا اختیار رکھ سکتا ہے۔

تیرے مقام کو انجم شناس کیا جانے
کہ خاک زندہ ہے تو تابعِ ستارا نہیں

منزل بہ منزل

مغرب کے انسانی نظریۂ ارتقا کا ماحصل یہ ہے کہ انسان جس شکل میں آج ہمارے سامنے موجود ہے، ابتداءً اسی شکل میں وجود میں نہیں آگیا تھا، بلکہ مختلف منازل سے گذرتے گذرتے اس مقام تک پہنچا ہے۔ جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے قرآن کریم سے بھی اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن اس تائید کے باوجود دونوں نظریات میں بنیادی فرق ہے، اور ایسا بنیادی فرق ہے۔ جن کی رُو سے حیات اور کائنات کے متعلق جو مختلف تصورات قائم ہوتے ہیں وہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ کائنات کے متعلق میکانکی تصور اُنیسویں صدی کے مادہ پرست علمائے طبعیات کی تخلیق ہے۔ جو یورپ میں نظریۂ ارتقا کے اولین علمبردار ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی غیر فانی مادہ میں بعض کیمیائی اور طبعیاتی تبدیلیوں سے خود بخود (محض اتفاقی طور پر) پیدا ہوگئی اور اس طرح کارواں حیات ارتقائی شاہراہ پر گامزن ہوگیا۔ اور رفتہ رفتہ ولیٔ کیفیت حیات نے میکانکی طور پر حیوانی پیکر

کی صورت اختیار کرلی۔ اس کے بعد حیوانی دماغ میں بعض اس قسم کی کیمیائی اور طبیعی تبدیلیوں سے شعور پیدا ہوگیا۔ اور اس طرح یہ شعور انسان کی شکل میں متشکل ہوگیا۔ اس کے بعد جب یہ میکانکی ارتباط منتشر ہو جائیگا تو زندگی اور شعور سب ختم ہو جائینگے لہٰذا زندگی یہی طبیعی زندگی ہے اور اسی کا تحفظ انسانی نصب العین ہے ——— اس کے برعکس قرآن کریم کی رُو سے زندگی بے جان مادہ میں کیمیائی اور طبیعیاتی تبدیلیوں کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ ہی انسان شعور حیوانی دماغ کے میکانکی ارتقاء کی اگلی منزل ہے۔ زندگی اور شعور کا سرچشمہ وہ الٰہ ہے جو اپنی حکمت کے ماتحت اس کائنات کو وجود میں لایا، اور اس کے بعد اپنی حکمتوں کے ساتھ اسے اس کے منتہیٰ کی طرف لے جا رہا ہے۔ چنانچہ انسان کی موجودہ زندگی ارتقاء کے اس سلسلۂ دراز کی آخری کڑی نہیں بلکہ یہ تمہید ہے۔

حیات ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے جو کائنات کی رگ و پے میں جاری ہے۔ الٰہ حیات کے علاوہ شعور کا بھی حامل ہے جس کا کائنات شعور سے خالی ہے۔ مغرب کے سائنس دان نے ہکسلی اور ہائیڈروجن کو دیکھا اور جب ان دونوں کو ملایا تو ان

کے باہم ملنے سے پانی بن گیا۔ لیکن تجزیہ سے ثابت ہوا کہ جو
خصوصیتیں پانی میں ہیں، وہ اِن دونوں گیسوں میں موجود نہیں ہیں،
چنانچہ وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ بے جان مادہ میں جب زندگی پیدا
ہوتی ہے تو وہ مادہ کے میکانکی ارتقا کا نتیجہ ہیں۔ زندگی کیسے
وجود میں آجاتی ہے، اِس کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا، اس
لئے اس کا نام ہنگامی ارتقاء رکھ لیا گیا۔ ان کے زندگی میں اور
اس قسم کے دیگر ہنگامی ارتقاء شعور کا سبب بن جاتے ہیں۔
اس نظریہ پر بہت اعتراضات ہوئے اور آخرکار اس نظریہ کا
خاتمہ ہو گیا۔ اگرچہ مغربی مفکرین اس میکانکی تصورات کی حدود سے
بہت آگے نکل چکے ہیں لیکن وہ تہذیب جو میکانکی بنیادوں پر
تعمیر ہوئی تھی اُنہی بنیادوں پر رہی۔ اس میں کسی قسم کی تبدیلی
نہیں ہوئی۔ چونکہ یہ کسی بنیادی غلطی تھی لہٰذا یہ نظریہ بھی اور یہ
تہذیب بھی نہ تھے اس حقائق کا ساتھ نہ کر سکی جسے قرآن کریم
نے پیش کیا۔ انسان حیثیت اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد
غلط خطوط پر رکھی گئی ہو قائم نہیں رہ سکتا۔ خواہ اِس غلط
نظام کو کیسی ہی دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے۔ جیسے درخت
کو اگر کھوکھلا ہو تو اُس پر پانی چھڑکنے سے اُسکی مضبوطی قائم

نہیں رہ سکتی نہ ہی اُس پہ سبزہ اُگ سکتا ہے کیونکہ اُس کے اندر نشو ونما کی قوتیں ہی نہیں ہیں۔ جب تک اس کا کھوکھلا پن موجود ہے اس کی تباہی یقینی ہے، تدبر کے معجزے اسے زندگی نہیں دے سکتے۔

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہو

خاکِ وطن

مسلمان کا وطن وہ ہے جہاں اللہ کی حکومت ہو۔ اگر کسی زمین پر قانون الٰہی زندہ نہیں ہے، تو یہ فضا مسلم کے مسلک کی سازگار نہیں ہو سکتی۔ ہجرت اس مسلکِ حق پرستی کی زندہ شہادت ہے۔ کہ مسلم انسانی محکومیت کی جراثیم آلود فضا میں پرورش نہیں پا سکتا۔ اسے سب سے پہلے اس فضا کو اپنے ملک کے ساتھ سازگار بنانے کی انتہائی کوشش کرنا چاہیئے۔ لیکن جب وہ دیکھ لے کہ فضا کی کثافتیں ایسی محکم ہو چکی ہیں کہ ان کا ردِ عمل ممکن نہیں ہو جائے اس کے کہ ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ کر اس غیر موافق ماحول میں غیر فطری زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جائے اسے لازم ہے کہ اس کی حدود سے نکل جائے۔ اور کسی ایسی زمین پر چلا جائے جہاں حکومتِ الٰہیہ کے قیام و بقا کے اسباب موجود ہوں۔ یہ آسان ہے۔ یہ ہے خاکِ وطن کی تعبیر جو مومن کے پاؤں میں زنجیر نہیں ہے کہ کسی خاص زمین میں پیوست ہو کر رہ جائے وہ تو فطرت کی طرف سے آزاد پیدا کیا گیا ہے۔ کہ جہاں اسے انسانی غلامی

پر مجبور کیا جائے وہاں سے نکل کر خدا کی غلامی میں چلا جائے۔

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

عظیم قربانی

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اطاعت گزار فرزند اسمٰعیل سے کہا کہ میں نے رات خواب میں دیکھا ہے کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں اور اس میں اللہ کا اشارہ موجود ہے۔ کہو تمہارا کیا خیال ہے:-

"اے فرزند میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں کہو تمہارا کیا خیال ہے" ($\frac{۳۷}{۱۰۲}$)

اس سعادت مند بیٹے نے جواب میں عرض کیا:-

"ابا جان! جو آپ کو حکم دیا گیا ہے بلا تامل کر گزریے، انشاء اللہ آپ مجھے ثابت قدم پائیں گے" ($\frac{۳۷}{۱۰۲}$)

باپ نے اپنی تمام شفقت اور بیٹے نے اپنی جوانی کو اس محبوب حقیقی کے ایک اشارہ پر قربان گاہِ عشق میں بلا تامل نذرانے کے طور پیش کر دیا:

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آداب فرزندی

مقامِ اکبر

ارشادِ خداوندی کی تعمیل میں باپ نے بیٹے کو زمین پر لٹا دیا چھری تیز کر لی اور ہاتھ میں لی، زمین کانپ اُٹھی کہ اس میں خونِ اسمٰعیل کے ایک قطرے کے متحمل ہونے کی ہمت نہ تھی۔ آسمان محوِ حیرت تھا کہ اس کی آنکھ نے اس سے پہلے ایسا عدیم المثال نظارہ کبھی نہ دیکھا تھا۔ یہ تسلیم و رضا کی آخری منزل تھی۔ اور یہ مقامِ اکبر تھا جو صرف حضرت اسمٰعیل کو ہی نصیب ہوا۔ یہ وہ مقامِ اکبر تھا جہاں اور جس کی بلندیوں پر پہنچکر انسان مسلم کہلانے کا مستحق ہوتا ہے:

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

[illegible]

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! [illegible] کی طرف رجوع کرتے ہوئے (حکم اللہ کا اتباع کرو) اور اس سے [illegible] کے نظام کو قائم کرو۔ اور ترک کرنے والوں میں سے نہ بنو۔ ان لوگوں میں سے نہ بنو جو [illegible] میں تفرقہ اندازی کی اور مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ہر گروہ اپنے اعتقادات پر خوش ہے۔

[illegible] ۳۲ (۳۰-۳۱)

[illegible] آج کی دنیا میں اس سے [illegible] مشکلات [illegible] آج [illegible] کے ساتھ [illegible] ضروری ہو گئی ہے کہ کون [illegible] ہے نہ نصاریٰ، پھر [illegible] کیا تھا۔ اسی لئے [illegible] حضرت رسول خدا [illegible] کیا یہ نسبتیں [illegible]

[illegible]

"شعیبؑ"

جب حق سے انکار، سرکشی اور بغاوت کرنے والوں کے پاس کوئی معقول جواب نہیں رہتا تو وہ استبدادی قوتوں کی دھمکیوں پر اتر آتے ہیں کہ یا تو اپنے مسلک سے باز آجاؤ یا ملک بدر کر دیئے جاؤ گے۔ لیکن جن کی آنکھیں حقیقت سے آشنائی پیدا کر چکی ہوں وہ ان کمزور دھمکیوں سے کیسے مرعوب ہو سکتے ہیں۔ جب حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کو حق کی دعوت دی تو انھوں نے کہا:۔

"اے شعیب! کیا تیری یہ نماز (جو تو اپنے خدا کے آگے پڑھتا ہے) تجھے یہ حکم دیتی ہے کہ ہمیں آکر کہے۔ ان معبودوں کو چھوڑ دو جنھیں تمھارے باپ دادا پوجتے رہے ہیں۔ یا یہ کہ تمھیں اختیار نہیں کہ اپنے مال میں جس طرح کا تصرف کرنا چاہو کرو۔ بس تم ہی ایک نرم دل اور راست باز آدمی رہ گئے ہو۔" (۱۱/۷)

حق و صداقت کو کس طرح رد کیا جاتا ہے، ازل سے یہی ہوتا

رہے اور ہوتا رہے گا۔ دعوتِ حق و صداقت کا شعار ہی
یہی ہے کہ اس کے مقابلے میں طاغوتی قوتیں میدان میں آجاتی
ہیں۔ اور جب دعوت کی پرورش طاغوتی قوتوں کے دامن میں
ہو اُن کا تو خدا ہی حافظ ہے

غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

زیر و بالا

جب حضرت موسیٰ مصر سے نکلے تو ان کے سامنے کوئی متعین منزل نہ تھی۔ مایوس نگاہیں آسمان کی طرف اٹھتی جہاں سے ہر ایک کو سہارا ملتا ہے۔ اور پھر وہ مدین کی طرف روانہ ہو گئے:

اور جب وہ مدین کے چشمہ پر پہنچے تو وہاں کچھ لوگوں کو پایا کہ وہ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں۔ اور ان کے علاوہ دو عورتوں کو بھی دیکھا جو اپنے جانوروں کو روکے ہوئے تھیں۔ موسیٰ نے ان سے کہا کہ تمہارا کیا معاملہ ہے؟ یہ دونوں الگ کھڑی ہوئی ہیں۔ لڑکیوں نے کہا ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتیں۔ جب تک یہ چرواہے اپنے جانوروں کو نہ لے جائیں۔ ہم پانی نہیں پلا سکتیں۔ اور ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے۔ (۲۸/۲۳)

آپ آگے بڑھے اور ان کمزوروں کے جانوروں کو خود پانی پلایا۔ پھر سایے میں آکر بیٹھ گئے۔ اور دل میں کہنے لگے کہ اے پروردگار میں تیرا محتاج ہوں۔ جو کچھ تو دے گا

[illegible] تھا چاہا یہ تھا کہ وہاں جا بسیں جہاں گزشتہ دنوں کو سنانے
[illegible] کوئی نہ رہے لیکن اس زمین پر تو کوئی گوشہ ایسا نہیں نظر آتا
[illegible] اور سلامتی پکار رہی ہے۔ انسان کی ضرورتیں اور زندگی
کے [illegible] بغیر [illegible] ایسی تعمیریں [illegible] کی [illegible]
[illegible] بالکل نہیں [illegible] ہوا [illegible] سارے زمین
[illegible] بغیر [illegible] لیکن جبر و استبداد کی قوتیں [illegible] کی [illegible] پر
[illegible] سے قبضہ جما لیتی ہیں جیسے ان کے باپ کی جاگیر ہو۔
[illegible] یہ چیزیں ان انسانوں نے اپنے کسب سے پیدا کی ہیں
[illegible] آتا [illegible] جانتے ہیں کہ یہ سب اللہ کی طرف سے سارے
[illegible] کے تصرف کے لئے ہیں۔ [illegible] کی تقسیم زیادہ [illegible] عدل
[illegible] زیادہ [illegible] ہونی چاہئے۔ [illegible] تو صحیح کے
[illegible] ہیں۔ [illegible] کوئی ان سے پوچھے کہ

یا تو [illegible] کی [illegible] کی [illegible]

[illegible] دریاؤں کی [illegible] تھا، [illegible]
[illegible] فرمایا [illegible] ہم سے باز پرس کرے
[illegible] پر [illegible] کا [illegible] آتا ہے

کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب
وہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں میری نہیں

قوت وراثت

وہ کنواری لڑکیاں جن کی بکریوں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پانی پلایا تھا اپنے گھروں میں گئیں، اور باپ سے کہا کہ آج ایسا واقعہ پیش آیا ہے۔ باپ نے کہا کہ جا کر اُسے گھر لے آؤ۔ جب حضرت موسیٰ اس ایک لڑکی کے ہمراہ اُس کے باپ کے پاس گئے، تو لڑکی نے باپ سے کہا کہ اسے اپنے ہاں ملازم کیوں نہ رکھ لیا جائے کیونکہ یہ صاحب جوان بھی ہیں اور قوی بھی ہیں:

[illegible] ایک لڑکی نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا جان [illegible] اپنے ہاں نوکر کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ یہ جوان [illegible] یہ آدمی [illegible] خدا پرستی [illegible] کرتے ہیں۔ شخص کے [illegible] اور صاحب [illegible] کے [illegible] نظام کو [illegible] نہیں چلا سکتا۔

لڑکی کے باپ نے معاملہ پر غور کر کے ایک صورت نکالی،
اُس نے موسیٰ سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنی دو بیٹیوں
میں سے ایک کا نکاح تیرے ساتھ کر دوں۔ اس شرط
پر کہ تو آٹھ سال تک میری نوکری کرے۔ پھر اگر تو دس
سال پورے کر دے تو یہ تیری طرف سے (حسن معاملہ) ہوگا
میں یہ نہیں چاہتا کہ تجھ پر ناجائز بوجھ ڈالوں۔ اگر اللہ
نے چاہا تو مجھے اچھے لوگوں میں سے پائیگا۔ (۲۸/۲۷)

حضرت موسیٰ نے اس سوال کے جواب میں کہا۔
کہ یہ میرے اور میرے درمیان عہد ہوا۔ جو بھی مدت آٹھ
یا دس سال کی میں پوری کر دوں مجھ پر زیادتی نہ
ہوگی جو کچھ ہم کہتے ہیں اُس پر خدا کارساز ہے۔ (۲۸/۲۸)

یہ وہ حسین جن کے ہاں حضرت موسیٰ اس انداز سے مہمان
ہوئے وہ حضرت شعیب ہی تھے، ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے
حضرت موسیٰ کے لئے ایسا انتظام کر دیا کہ وہ فراعنہ کے محلات
سے نکل بھاگ کر میدان مدین کے مجوزہ دائرہ سے واقف ہو جائیں
اور یہ ماحول پیدا کر دیا کہ مدین آنے کے قرینے بن جائیں۔

اگر کوئی شعیب آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

فرعون و کلیم

دنیا میں ہر مستبد، قوت رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضے میں
کر لیتا ہے۔ اسی طرح فرعون نے بھی کر رکھا تھا۔ ملک اپنی ملکیت
اعلان بھی کر دیا۔ دربار پر حضرت موسیٰ نے کہا میرا مذہب تو
تمہارا ہی رہا ہے۔ فرعون یہ سنتے ہی آگ بگولا ہو گیا۔
اور منتر کے بچے ہیں۔ فرعون کو مخاطب کر کے کہا کہ تم جانتے ہو کیا
کہہ رہا ہے؟ حضرت موسیٰ نے پھر الفاظ دہرائے اور کہا:

"اگر وہ (فرعون) تمہارا رب ہے، اور تمہارے بزرگوں کا بھی رب ہے" (۲۶/۲۶)

فرعون نے پھر اہل دربار کی طرف دیکھا اور کہا۔ "حاضرین
سب یہ کیا کہہ رہا ہے؟ اور یہ میرے پہلے بزرگ یعنی وہ تمام
زندگی کی حقیقت کے سامنے دنیا کا جتنی تھی اس کے نزدیک کتنا
تھا لیا۔ کیسی ایسی آئی تھی کہ کوئی سنتا ہے!

فرعون نے کہا۔ یہ رسول کہ جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے، دیوانہ
ہے۔ اور کیا کہہ رہا ہے کہ کچھ نہ سمجھو۔ (۲۶/۲۷)

حضرت موسیٰ نے فرعون کو اس گستاخ تنقید پر اسی پیغمبر کا جواب

کیا، اور پھر فرمایا کہ وہ اللہ صرف تمہاری حکومت کے دائرہ میں بسنے والوں کا ہی خدا نہیں ہے بلکہ وہ ارض و سموات کا رب ہے۔

"موسیٰ نے کہا کہ وہ ذات مشرق و مغرب اور اُن کے مابین جو کچھ ہے سب کا رب ہے۔ اگر تم کچھ عقل رکھتے ہو تو اس حقیقت کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔" (۲۶/۲۸)

فرعون نے سُنا اور غصّہ سے لال پیلا ہو گیا۔ اب جو اُس نے دیکھا کہ اُس کے دعویِ ربوبیت کی یوں سرِ محفل دھجیاں اُڑائی جا رہی ہیں، تو ظلم پر اُتر آیا جو ظالم قوتوں کا خاصّہ ہے۔ اور کہا:

"اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو خدا تسلیم کیا تو میں تجھے قید کر دوں گا۔" (۲۶/۲۹)

ایک فرعون کا کیا ذکر، دنیا میں ہر فرعونی قوت انسانوں کو اپنے سامنے جھکانا چاہتی ہے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

جب موسیٰ فرعونوں کا ایک گروہ اللہ کی طرف سے آ گیا تو فرعون کے ماننے والوں نے فرعون سے کہا کہ موسیٰ کی امانت قبول کر لینی چاہیے۔ اس پر فرعون نے

کے دماغ میں حکومت کی بُو تھی۔ کہا۔ کہ ہم جو ہماری محکومی میں ہے
اس کا حکم ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں، چنانچہ اسی خیال کو
اس جماعت نے دُہرایا۔

"آپ تو ہمیں کہتے ہیں کیا ہم اپنے ہی طرح کے دو آدمیوں
پر ایمان لے آئیں۔ حالانکہ ان کی قوم ہماری عبودیت و اطاعت
و محکومیت اختیار کئے ہوئے ہے!" (۲۳/۴۷)

اس جواب سے صاف قوم کی نفسیاتی کیفیت اُبھر کر سامنے
آ جاتی ہے۔ غالب قوم کی ہر ادا مغلوب قوم کو پسند ہوتی ہے
اور اس کے مقابلہ قوم کا مقابلہ مغلوب قوم کی نفسیات میں
داخل ہے کہ مغلوب قوم کے نظریات بھی دین کچھ ہو جائے تو
بھی قوم کے نزدیک قابل قبول نہیں ہوتا۔ حاکم قوم کے
دین کی یہ بات تو خیر سمجھ میں آ سکتی کہ محکوم قوم جو کہ اپنی
اپنی حالت کے لحاظ سے درست ہی ہے اس کو
قوم کا اعتماد بھی نہیں ہوتا:

"کیا ہم ایمان لے آئیں اور قوم حسن و زیبائی میں
ہمیں پیچھے چھوڑ دے۔ حسن و زیبائی میں آگے بڑھ
جائے۔ نہیں سنتے غلاموں کی یہ جرأت ہو
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ بنے رہنا

جادو کے سامری

حضرت موسیٰ علیہ السلام خلوت گزینی کی خاطر طور کی چوٹیوں پر تشریف لے گئے اور حضرت ہارون کو بنی اسرائیل کی نگرانی کے لئے چھوڑ گئے۔ حضرت موسیٰ کے ساتھ سامری (سامری) قوم کا ایک آدمی بھی تھا۔ یہ شخص بظاہر ایمان لے آیا تھا لیکن اس کے ضمیر میں ابھی تک شکوک موجود تھے۔ حضرت موسیٰ کی عدم موجودگی سے اس نے خوب فائدہ اٹھایا۔ اور قوم کو ایک سونے کی بنی ہوئی زیورات سے لدا ایک بچھڑے کا بت بنایا کیونکہ یہ قوم گائے کی پوجا کیا کرتی تھی۔ اس شخص نے بچھڑے کے پیٹ میں ایک ایسی کل رکھ دی جو ہوا کے زور سے آواز پیدا کرتی تھی۔ اس طرح سامری نے اس بچھڑے کو دیوتا مشہور کر دیا۔ لوگ جوق در جوق اس کی پوجا کرنے لگے اور اس کی کرامات پر ایمان لے آئے اور انہوں نے حضرت موسیٰ سے پھر گئے۔ حضرت موسیٰ کو ایک طرف تو قوم کی گمراہی کا دکھ تھا دوسرے سامری کے اس جادو سے پریشان ہو گئے۔

غلامی میں پرورش پانے والی قوم پھر غلامی کی طرف لوٹ گئی:

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کہ کیا ہے راہ و رسم شاہبازی

قلب و دماغ

وہ لوگ جن کے قلوب ایمان کے نور سے منور نہیں ہو سکے صرف دماغ تک رسائی ہو سکی ہے، اُن میں یقینِ محکم پیدا نہیں ہو سکتا۔ ایسے لوگ حضرت موسیٰ کے حلقے میں بھی موجود تھے۔ جو انھیں دوبارہ بت تراشی و بت پرستی کی ترغیب دے رہے تھے کبھی گوسالہ پرستی کی درخواست گذارتے تھے۔ کبھی خدا کو آنکھوں سے دیکھنے کی ضد کرتے۔ یہ حالت صرف محکوم قوم کے افراد کی ہے۔ اس کے برعکس ایک آزاد قوم کے افراد تھے حالانکہ ایک عمر کفر میں بسر کی، لیکن جونہی حضرت موسیٰ کو صاحبِ ایمان دیکھا اور حق و صداقت کی روشنی نظر آئی پروانوں کی طرح اس شمع وحدت پر جمع ہو گئے۔ اور پھر اپنے ایمان پر اس انداز سے جم کر کھڑے ہوئے کہ فرعون کی کوئی طاقت، کوئی دھمکی کوئی آواز انھیں ایک انچ نہ ہٹا سکی۔ یہ خودیِ محکم کا اعجاز ہے۔ محکوم قوم کا سینہ نورِ خودی سے منور نہیں ہوتا بلکہ وہ عقل کے تابع ہوتے ہیں:۔

آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال
کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منوّر
محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات

ہمارا ماضی

مسلمانوں کے ماضی (دورِ عمل) پر نظر ڈالیے۔ جب ان کی نگاہوں سے قوموں کی تقدیریں بدل جایا کرتی تھیں، اُس وقت اُن میں نظری مباحث دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ان کی قوتیں منطقی موشگافیوں اور فلسفیانہ نکتہ آرائیوں میں صرف نہیں ہو رہی تھی۔ ان کے الفاظ گورکھ دھندوں کی طرح اُلجھے ہوئے نہیں تھے کہ عمل کی صرف کوئی قدم نہ اٹھتا۔ اس قوم میں شاعری نہیں تھی بلکہ ـــــ شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر کی داستانیں تھیں۔ لیکن جب یہ دور ختم ہو گیا تو پھر زندگی کے ہر شعبے میں شاعری شروع ہو گئی۔ عمل کی بجائے

نظری مسائل میں اُلجھ کر رہ گئے۔

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے
ہیں صفاتِ ذاتِ حق حق سے جُدا یا عین ذات
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے
یا مجدد اس امت میں اُس نمونہ مریم کے صفات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدہ میں نجات

تمہارے لوگ دیکھا دیکھی حضرت موسیٰ کی قوم میں بھی باطل پرستی کے خیالات آ گئے تھے۔ اُسے ختم کرنے کے لئے حکم ہوا کہ گائے کی قربانی کرو۔ یہ حکم سُن کر لوگوں نے حجت کی اور پوچھا کہ یہ کیسا حکم ہے کیا تم ہم سے تمسخر تو نہیں کر رہے! حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ میں کبھی تمسخر نہیں کر سکتا۔ پھر انہوں نے حجت کی اور کہا کہ تم اپنے حکم دینے والے خدا سے پوچھو کہ گائے کا رنگ کیا ہو؟ جواب دیا کہ اس کا رنگ نہ گہرا نہ ہلکا ایسا کہ دیکھنے والوں کا بھی خوش ہو جائے۔ جب اُس کی خصوصیت بھی متعین ہو گئی تو پھر حجت کی اور کہا کہ ہمیں تو جانور کی پہچان مشکل ہے ذرا اپنے خدا سے اس کی وضاحت کرا دو۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ ایسی گائے جو نہ کبھی

اب یہ بحث ہو نہ کبھی آپ اپنا حق کے لئے کام میں لائی گئی تھی خاص پر کوئی
ایسا دیا ہو۔ اس جواب پر جب وہ ضرور سوال نہ کریں گے تو تعجیل کے لئے
ساجد آ گئے اور مجبوراً ایک کا سے ذوق کی خاطر کہ وہ آئے نہ بتائے
ان حالات سے معلوم یہ نہیں کہ سمجھ میں نہیں آیا تو پھر آپ
سے نہ پا بتے تھے تاکہ گوسان پر ستش قائم رہے۔

تکلف سے بیگانہ انسان صد مروت
ہر چیز کہ متعلق کی لیلوں میں ہے چالاک

زوالِ بیجاپور

حضرت سلیمان علیہ السلام کے وقت میں بنی اسرائیل کا دبدبہ کمال
پر تھا ان کی شوکت و شہرت عروج پر تھی۔ بیت المقدس کے نقشے کی
تعمیر میں زمانہ میں بے مثال۔ لیکن اس کے بعد ان کے زوال کے اسباب
پیدا ہو گئے۔ قوت و دولت کا غلط استعمال ان کی تباہی کا سبب بنا۔
یہ قوم کبھی بابل کی قید و تاراج کی آماجگاہ بنی کبھی ایرانیوں
کی غلامی میں پھنسی کبھی رومیوں کی حکومت اختیار کی اور اس طرح یہ قوم
پارہ پارہ ہو کر ادھر ادھر آوارہ بھیڑوں کی طرح پھرتی رہی جہاں

پہنچی دھکے ملے۔ یہ سب اس لئے کہ قوانین الٰہیہ سے منہ موڑ لیا تھا۔

کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو
کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی

تاریخ نے یہ بات بے نقاب کر دی کہ جب تک قوم کی نگاہوں کا رُخ نہ بدلے اُن کا ذہن نہیں بدل سکتا۔ ذہن کے بدلنے سے قومی تعلیم کے رُخ بدل جاتے ہیں۔ اور تعلیم بدل جانے سے دل بدل جاتے ہیں۔ اور جب تک دل نہ بدلیں خیالاتِ انسانی، اور شعورِ انسانی پر کوئی پیغمبری اثر پذیر نہیں ہوتی۔ اس حقیقت کے آئینے میں اُتر کر ذرا اپنی موجودہ تاریخ دیکھئے کہ برسوں سے ہندوستان میں آزادیِ وطن کی تحریک سرگرمِ عمل تھی لیکن عوام اس سے محض کھیل رہے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ کانگریس میں کوئی ایسا قائد نہ پیدا ہوا جس نے دل بدلنے کی کوشش کی ہو۔ مگر ہمارے قائداعظمؒ اُٹھے اور صرف ۳ سال میں مردہ قوم کے ڈوبتے ہوئے بیڑے کو کھینچ کر ۳ آزادی تک لے آئے۔ اگر اُن میں یہ صلاحیت نہ ہوتی تو ہماری قوم بھی سامری کی طرح حضرت موسیٰ کے حضور میں ہزار بتیں پیش کرتی

حقیقت ایک ہے ہر شے کی پس پردہ
کہ دل گر صاف ہو تو کرتا ہے عریاں کو نگاہی

دین شیر قاین غلاموں کے امام، اور شیوخ
دیکھتے ہیں فقط اک فلسفہ و باہی
ہو اگر قوتِ فرعون کی در پردہ مرید
تو ہم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیدِ الٰہی

یکم بحث

یہود نے کتاب اللہ کو الگ رکھ دیا تھا اور باہمی اختلافات کو ختم کرنے کے لیے ان کے ہر گروہ کے عالم اور شیخ نے ایک کتاب لکھ دی، اور پھر خداوندی کی طرف رجوع کرنے کی بجائے وہ لوگ اپنے علماء اور مشائخ کی وضع کردہ شریعت کو عین دین سمجھنے لگے۔ یہی اُن کی بربادی کا سبب تھا۔ ان علماء کی حالت یہ تھی کہ کتاب اللہ کی سیدھی سی تعلیم کو [illegible] اور مباحثوں میں الجھ کر کتابیں تصنیف کرتے چلے جاتے [illegible] قرآن کریم میں ہے کہ

[illegible] لوگوں کی مثال جو تورات [illegible] کے حامل ہیں [illegible] گدھے جیسی مثال ہے جو اپنی پیٹھ پر [illegible] کتابیں لادے ہوئے ہو۔ کیسی بُری مثال ہے ان لوگوں

کی جو اللہ کے احکام سے متعلق آیات کو جھٹلاتے ہیں، اور یاد رکھو۔ خدا ظالم لوگوں کو کبھی سیدھی راہ نہیں دکھایا کرتا کہ یہی اس کا قانون ہے۔" (۲۷/۵)

جیسے پیشکار اور عملی زندگی معیارِ انسانیت سے گری ہوئی:

قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

گرفت و رحمت

اللہ تعالیٰ انسانوں کو بُرے اعمال کی سزا بھی دیتا ہے اور جیسے چاہے بخش بھی دیتا ہے۔ سزا و جزا اُس کی رحمت پر منحصر ہے۔ یونس علیہ السلام کے قصہ میں ایک نمایاں واقعہ آتا ہے:

"پھر (جہاز کے) مسافروں کے ساتھ یہ بھی شریک ہو گئے۔ چنانچہ وہ اُن لوگوں میں ہو گئے جو سمندر میں ڈال دیئے گئے۔ پھر ایک مچھلی نے اُن کو نگل لیا، اور وہ اپنے آپ کو اُس وقت ملامت کر رہے تھے" (۳۷/۱۴۰-۱۴۲)

اللہ کی طرف سے انہیں یہ سزا ملی تھی کہ انھیں مچھلی کے پیٹ میں رکھا گیا۔ اس کے بعد حکم خدا مچھلی نے ساحل پر اُگل دیا۔ پھر انہیں نینوا کے باشندوں

[illegible] اعمال کے نتائج کی آگاہی کے لئے بیجا، چنانچہ آپ وہاں [illegible] لگے۔ یہ باتیں سن کر ان پر ایمان لے آئے اور خدا نے ان پر [illegible] کے بدلے رحمت نازل کی۔ دیکھا جائے تو حضرت یونس علیہ السلام [illegible] زندگی عطا ہوئی تھی، ورنہ ایک بار تو وہ ختم ہو ہی چکے تھے۔

زندگانی ہے صرف قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ جہاں تنگ نہیں ہے کہ تو وسعت سے بھی مر نہ سکے

مناظرے

[illegible] رواج ہو گیا ہے کہ مباحثوں اور مناظروں کے [illegible] فطرت سے نائب ہو گئے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے [illegible] نبوت کا دعویٰ کیا اُدھر دوسرے نے خدا کا دعویٰ دائر کر دیا [illegible] میدان میں آ گئے اور ایک تیسری پارٹی جو ان دونوں [illegible] تھی وہ بھی اس کی ساتھ دینے سے تو تھی [illegible] دونوں [illegible] میدان آ گئے۔ [illegible] ہٹے کٹے [illegible]

ڈنڈے ہاتھ میں لئے اسٹیج پر آتے جن کے آنے سے فضا نعروں سے گونج اُٹھتی۔ رات رات بھر ایک دوسرے کو جھوٹا اور ملعون ثابت کرنے کی کوششیں جاری رہتیں۔ گالیاں تک سُنائی جاتی تھیں، اور صبح دونوں پارٹیاں اپنے اپنے دعوے پر اکڑ اکڑ کر باتیں کرتی تھیں کہ ہم نے کل رات جنتا میں میدان مارا۔ اور ہمارے مولوی صاحب نے اُس مولوی کو مناظرہ میں پست کر دیا۔ یہ تھیں وہ باتیں جو ہمارے مولویوں کی وجہ سے ہوا کرتی تھیں اور آسمان ان پر ہنسا کرتا کہ:۔

دانائے نادانی قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو
اِس سراپا رنگ و بُو کو گلستاں سمجھا ہے تو

شاخِ نازک

جس طرح ایک حکیم مریض کی شکل دیکھ کر بتا دیتا ہے کہ یہ مریض فلاں مرض میں مبتلا ہے اور اب اس کا علاج یہ ہے، اور اگر اُس نے صحیح علاج نہ کیا تو اُس کے یہ نتائج برآمد ہوں گے۔ چنانچہ حکیم کا ایک ایک لفظ صحیح نکلتا ہے۔ کیا حکیم کو الہام ہوا تھا یا اُس پر وحی نازل ہوتی تھی؟ نہیں، بلکہ اُس نے اٹل قوانین کے ماتحت فیصلہ کر کے باتیں بتا دی تھیں۔ یہی کیفیت

انسانی حیات اجتماعیہ کے قوانین کی ہے۔ جس شخص کی نگاہ ان قوانین پر ہے وہ کسی قوم کی موجودہ روش سے بتا سکتا ہے کہ اس قوم کا انجام کیا ہوگا۔ اور چونکہ یہ اٹل قوانین قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔ چنانچہ جس کی نظر قرآن کے اندر پہنچ کر نور حاصل کر لیتی ہے وہ اس کی روشنی میں آنے والے حالات کو سہولت سے دیکھ سکتا ہے۔ اور پورے یقین کے ساتھ پکار اٹھتا ہے کہ اے مجنونِ تہذیب کا فریب کھانے والو!

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

ایمان و قوت

آج کسی ملک یا قوم کی قوت کا دارومدار صرف دو باتوں پر ہے۔ سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ گنتی میں کتنی ہے۔ افراد کے سر دن گنا جاتے ہیں بلکہ ہاتھوں کو جبکہ کسی قوت کو تسلیم کرنا ہو تو اسے تعداد سے ووٹ (رائے) لئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد اسلحہ کی مقدار دیکھی جاتی ہے۔ اگر یہ دونوں چیزیں واقعی اس قوم کے لئے درست ہیں تو سب اور کچھ ہیں مگر یہ کہ جب حضرت رسول اللہ کو مکہ کے دو نوں

کے لوگوں کی ہدایت کا حکم ہوا تو اُس وقت آنحضرت کی جماعت میں کتنے افراد تھے؟ کل چالیس افراد کی جماعت تھی، آج شمار گنتی کے چالیس آدمیوں کو جماعت کا نام بھی نہ دیا جا سکے۔ لیکن وہ آدمی نہیں تھے بلکہ ایمان کی چالیس قوتیں تھیں، اُن چالیس مقدس پیکروں کے سینے میں جو قلب متحرک تھے ان کی دھڑکنوں میں کتنی قیامتیں چھپی ہوئی تھیں، اُس وقت قوتوں کا مقیاس ایمان کی حرارت تھی، اور اس حرارت کے سامنے بڑی سے بڑی قوت بھی نہیں ٹھہر سکتی۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

بے یقینی

قوموں کی موت و حیات کا مدار اُن کی قوتِ ایمان پر ہے۔ اگر انھیں اپنے مسلکِ حیات کی صداقت پر یقین ہے اور وہ یقین ڈانواں ڈول نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں میں پیوست ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت انھیں ان کے مقام سے نیچے نہیں گرا سکتی۔ لیکن جہاں ان کے یقین کی قوت کمزور ہوتی ہے، موت کا پنجہ انھیں فوراً اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے

مرتے ہیں مسلمان جن کا شعار صرف مردہ شہادت کے رجسٹر میں ہے۔ کیا تجھ
سے کہتے ہیں کہ مسلمان قوتوں کا سرچشمہ ہے۔ مسلمان کی قوتوں کے سامنے پہاڑ
بھی کانپتے ہیں، وہ دراز سے دن بتائے کہ

نہیں ہے شعلہ خلیل آتش نشینی
یقین اللہ مستی خود گزینی
نہ لے ہے تہذیب حاضر کے گرفتار
غلامی سے بتر ہے بے یقینی

حسب و نسب

کتاب قرآن کی رو سے اس لئے ناجائز ہے کہ اس میں حقوق
[illegible] بنا پر ہوتی ہے۔ نبی آدم
[illegible] استحقاق رکھنے کے لئے آلے اور تمام [illegible] اسی
[illegible] اور اس کی کوشش کرنی معیار قائم کرنے کی سعی فرمائی تھی
[illegible] کی طرف جس نبی کا
[illegible] کی سرداری حضرت اسامہ بن زید کو عطا فرمائی تھی کہ
[illegible] ایک غلام زادہ تھے۔ اس لئے بعض منافقین نے اس پر

اعتراض کیا تو حضور نے فرمایا کہ:

"اگر اسامہ کی سرداری پر تم کو اعتراض ہے تو اس کے باپ کی سرداری پر بھی تم معترض تھے، خدا کی قسم وہ اس منصب کا مستحق تھا۔"

اس کے علاوہ حضورؐ نے وفات سے پہلے آخری خطبہ ارشاد فرمایا اس کے آخری الفاظ یہ ہیں کہ:

"اے پیغمبر کی بیٹی فاطمہؓ، اور اے پیغمبر کی پھوپھی صفیہؓ خدا کے ہاں کے لئے کچھ کر لو۔ میں تمہیں خدا سے نہیں بچا سکتا۔"

پہلی مثال سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ کوئی رتبہ نسل پر یا مخصوص نسل کے لئے مخصوص نہیں ہو سکتا۔ ہر قابل آدمی کا حق ہے کہ اپنی قابلیتوں اور صلاحیتوں کے مطابق آگے بڑھے۔ اگر ایک غلام کا بیٹا جو ہر ذاتی کی بنا پر کسی اونچے مرتبے کے لائق ہے تو اسے ملنا چاہیئے اور دوسروں کو اس کی سرداری قبول کرنی پڑے گی جو نسل کے اعتبار سے اس سے بہت اونچے ہی کیوں نہ ہوں، اور دوسری طرف یہ کہ خدا کی میزان میں اصل وزن عمل کا ہے۔ حسب و نسب یا تعلقات کا نہیں ہے۔ حتیٰ کہ پیغمبر کی بیٹی بھی معیار خداوندی سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ جو لوگ حسب و نسب کو مقدم رکھتے ہیں وہ درحقیقت اسلام کے خلاف ایک زہریلا پروپیگنڈا کرتے ہیں، اور یہ بہت بڑی سازش ہے جس کے

ذات اسلامی تعلیم و تصورات کو کائنات کے گوشے گوشے میں ذلیل کر دیں گے
اور تاریخ شاہد ہے کہ انہی تصورات نے روحِ اسلامی کو ضعف پہنچایا ہے۔ برہمنوں
کی طرح یہاں بھی ہر سید کو واجب الاحترام سمجھا جاتا ہے خواہ اس کے
اعمال خلافِ قرآن ہی کیوں نہ ہوں۔ ان تصورات کے صدقے میں اسلام
اور ملتِ اسلامیہ مختلف فرقوں میں تقسیم ہو گئی۔ ہوا یہ کہ یہی گروہ ذاتیں بن
گئیں۔ اور یہی ذاتیں اونچے نیچے طبقات میں منقسم ہو گئیں۔ اور اس طرح
اسلام رفتہ رفتہ اس عہدِ جاہلیت میں جا پہنچا جہاں سے اسلام نے
کفارِ عرب کو نکالا تھا۔ انگریز کی حکومت نے یہ شگون مبارک سمجھا، اور
اسی خصوصیت کے ساتھ فوج، پولیس، اور دوسرے محکموں میں انہیں
مخصوص کر دیں۔ بلکہ اس نے تو جماعتوں کے علاوہ زمین کو بھی اسی نظریہ کے
ماتحت تقسیم کر دیا۔ اور بنگال کے مسلمان کو فوجی خدمات کے ناقابل سمجھ کر
نادرہ بنا دیا۔ آج بھی جبکہ ہماری اپنی حکومت قائم ہو گئی ہے، جسے مسلسل
تلقین کی جا رہی ہے اسلامی حکومت کہا جا رہا ہے، یہی چیز نمایاں اور پیش
پیش ہے۔ صوبہ بندیاں سختی سے قائم ہیں اور صوبہ کا تناسب بھی قائم
ذات پات کی تخصیص بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اور اقربا پروری کا دور
دورہ ہے۔ اگر ان چیزوں کے خلاف کوئی آواز اٹھائے، اس پر
سخت گرفت ہوتی ہے کہ وہ منکرِ حدیث کہلایا جاتا ہے۔ پھر انہیں

اسبابِ زوال کون بتائے؟

خضر کیونکر بتائے کیا بتائے
اگر ہمراہی کہے دریا کہاں ہے؟

عناصرِ مومن

قرآن کریم نے مومنین کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

"بلاشبہ آسمان اور زمین کی خلقت میں اور رات دن کے ایک کے بعد ایک آتے رہنے میں ارباب دانش (مومنین) کے لئے معرفت حق کی بڑی ہی نشانیاں ہیں۔" (۳/۱۹۰-۱۹۱)

جہاں تک تنہا علم کا تعلق ہے وہ عقل تک محدود ہے اس سے صرف ذہنی بصیرت حاصل ہوتی ہے قلبی تسکین نہیں۔ اس کے ابتدا تنہا عمل ہے۔ اس سے قلبی سکون تو مل جاتا ہے لیکن دوسرے پر کسی شے کی وضاحت نہیں کی جا سکتی۔ لیکن تیسرا طریقہ علم و عمل کا ہے جس سے ذہن جلا پا کر آگہی عطا ہوتی ہے اور سعی و عمل سے سکون قلب حاصل ہوتا ہے۔ یہ قرآنی طریق تربیت ہے، جس کا حاصل مومن ہوتا ہے:-

غنا تھا اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جاں
تجھ کی حسنِ طبیعت۔ عرب کا سوزِ دروں

اس حقیقت کو ان الفاظ میں نمایاں کیا ہے:

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوزِ جگر ہے علم ہے سوزِ دماغ

مرکزیت

آپ پرکار سے دائرہ بنائیں۔ اور پھر پرکار کی نوک مرکزی نقطہ سے ہٹا کر کسی دوسرے نقطہ پر رکھ کر دائرہ مکمل کرنے کی کوشش کیجئے۔ مگر بہتر کوشش کرتے رہیے، دائرہ کی ماہیت و صورت کبھی درست نہیں ہو سکے گی تاوقتیکہ نوک کو پھر سے مرکزی نقطہ پر نہ لایا جائے۔ یہی کیفیت اصولِ دین کی ہے۔ پرکار کو اصولِ دین تصور کر لیجئے اور دائرہ کو حیاتِ اجتماعیہ۔ حیاتِ ملی، اور پھر ان اصول پر غور فرمائیے کہ کیا اصول کو ہٹا کر حیاتِ اجتماعیہ کا نظام قائم رہ سکتا ہے؟ نہیں۔ کیونکہ تو اصول کی ہستی کا مدار ان کی مرکزیت پر ہوتا ہے۔ ان کی بیگانہ حیثیت اور امتیازی خصوصیت اسی نقطہ سے وابستہ ہوتی ہے۔ اگر ان کی مرکزیت میں خلل واقع

ہو جائے تو ان کی ملّی حیثیت کا سارا شیرازہ بکھر کر رہ جاتا ہے۔ قوموں کا خصوصی امتیاز ان کا اندازِ فکر ہے جو ان کی معاشرت کا لباس پہن کر دنیا کے سامنے آتا ہے۔ اور اس معاشرت کی نگراں قومی سطوت و قوت ہوتی ہے۔ دنیا میں کسی قوم کی تہذیب زندہ و سلامت نہیں رہ سکتی جب تک کہ اُس کی پشت پر قوت و اقتدارِ حکومت نہ ہو۔ قوت کا دوسرا نام مرکز ہے جسے دارالسلطنت کہتے ہیں۔ قوموں کی بقا و فنا میں سب سے زیادہ ہاتھ اس دارالسلطنت کا رہا ہے۔ بڑی سے بڑی حکومت کو فتح کرنے کے لئے صرف اس کے دارالسلطنت کو فتح کر لینا کافی ہوتا ہے۔ کیونکہ اسی مرکز سے ساری سلطنت کے تار و پود کا رشتہ قائم ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ شہر بھی دوسرے شہروں کی طرح اینٹ پتھر سے بنا ہوتا ہے۔ ہر شہر ہر بستی جو دائرہ کے اندر ہے ایک قانونِ حکومت کے ماتحت سانس لے رہی ہوتی ہے لیکن اس ایک شہر (دارالخلافہ) کی شکست سے تمام کا تمام ملک غیر شعوری طور پر شکست تسلیم کر لیتا ہے۔ یہ اس لئے کہ اس مرکز سے ایک احساس وابستہ ہوتا ہے جب تک یہ احساس کا رشتہ نہیں کٹتا حیاتِ اجتماعیہ کا نظام برقرار رہتا ہے۔ جس طرح فضا میں گم ہو جانے کے باوجود پرندے کی نگاہیں اپنے آشیانے پر رہتی ہیں۔ کیونکہ یہی مرکزی تعلق ختم ہوا باوجود ایک دائرہ میں رہنے کے تمام ایک دوسرے سے بیگانہ ہو جاتے ہیں جس طرح ہاتھ کا

جھونکا آنے سے صحرا کے ریت کے ذرّے۔ جب تک پتنگ کا رشتہ ڈور سے قائم ہے لاکھ آندھی آجائے فضا میں طوفان آجائیں یہ الگ نہیں ہو سکتی لیکن ڈور کے ٹوٹ جانے سے فضا ساکت ہی کیوں نہ ہو، پتنگ آوارہ ہو جاتی ہے اور ایک ہلکی سی ہوا اس کا رُخ بدل دینے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ع

"موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں"

یہ ایک قانون ہے جو حسب و نسب اور رنگ و نسل میں تمیز نہیں کرتا۔ لیکن قومِ مسلم کے لیے یہی قانون ذرا مختلف اور مخصوص ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ دین صرف دینِ اسلام ہے باقی کوئی دین نہیں ہے۔ دین، سیاہ کے علاوہ تمام گروہ بندیاں ہیں جو اللہ کو پسند نہیں۔ لہٰذا وہ لوگ دین کو ماننے والوں کے لئے یہ قانون قانونِ الٰہی بن جاتا ہے یہی قانون اور یہی خصوصیت ملتِ اسلامیہ کو دیگر اقوام عالم سے ممتاز کرتی ہے۔ قرآن میں ہے کہ:

"اے نبی! کہہ دو کہ اگر آپ کو تو بس خدا اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں ان کی حمایت میں رکھے تو وہ تمہارے لئے امن ہے۔ ان میں اتحاد پیدا کرنے والی ایک قوت پیدا کر دیتا اور تم سے تمہاری برائیاں دور کر دے گا۔ یہ وہ ہیں کہ جو تم پر احسان کرنے والا ہے۔" (۸/۶۲)

اس کے تو یہ ہیں خاکی حاکمیت کے دستور میں دینی مسلمان کا

نصب العین ہے۔ اور ان قوانین خداوندی کا نفاذ قوت و سطوت کے بغیر ناممکن ہے۔ یوں سمجھئے کہ حکومت الٰہیہ کے لئے پہلے حکومت اسلامیہ کا وجود لازم ہے۔ مرکزِ اسلامیہ کی تعمیر کا حکم حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیا چنانچہ آپ نے سب سے پہلا مرکز تعمیر کیا۔ اور یہی کعبہ کی عمارت کا سنگِ بنیاد تھا۔ اور یہی کعبہ تمام نوعِ انسانی کے لئے مرکزِ امن و سلامتی قرار پا گیا۔ چنانچہ قرآن کریم میں اس کی شانِ مرکزیت کے متعلق ارشاد ہے کہ:

"اور (پھر دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے (کعبے) اس گھر کو انسانوں کی گرد آوری کا مرکز اور امن و حرمت کا مقام ٹھہرایا اور حکم دیا کہ ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ (ہمیشہ کے لئے) نماز کی جگہ بنائی جائے۔ اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کو حکم دیا تھا کہ ہمارے نام پر جو گھر بنایا گیا ہے اسے طواف کرنے والوں، عبادت کے لئے ٹھہرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے ہمیشہ پاک رکھنا (اور غیر خداوندی نظام کی گندگیوں سے آلودہ نہ کرنا)"

(سورۃ بقرا ۲/۱۲۵)

پھر اسی پہلے گھر سے اذان بلند ہوئی جسے سن کر افلاک لرز گئے لیکن آج وہ گھر تو موجود ہے لیکن گھر والے گھر کے اندر نہیں ہیں بلکہ اپنے مرکز سے الگ۔

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے
کھویا گیا کس طرح تیرا جوہرِ ادراک

کیوں طرح پیدا کنم جانِ تپرا نشتر عشق
ہر رگِ جانِ کیوں کہ جانِ دل کے جگر چاک
تو ظاہر و باطن کی خلافت کا سزاوار
کیا شعلہ بھی ہوتا ہے غلامِ خس و خاشاک
فقر و ذکر و نجم و بکوم تیرے کیوں
کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک

زوال کے اسباب کا ذکر صرف اتنا ہی ہے کہ عزت چھین گئی عزت کی جگہ ذلت ہے اور ذلت کا انجام کیا ہے۔ لہٰذا عزت کی بازیابی ضروری ہے۔ لیکن اسی وقت یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ جب ہم نے اپنا رشتہ خدا سے توڑ کر غیر اللہ کو اپنا حاکم قرار دیا ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] (سورۂ آل عمران ۱۔ ۳۳)

یہ ہے وہ امن و سلامتی کی جگہ جس کی حدود میں داخل ہو کر شرفِ انسانیت کے نیاز حاصل ہو جاتے ہیں۔ آج مسلمان کا دنیا کا ہر انسان جستجو میں ہے کہ اس لمبی چوڑی دنیا میں کہیں کوئی گوشہ عافیت کا مل جائے۔ جہاں پہنچ کر درندہ صفت انسانوں کے استبداد سے نجات مل سکے۔ یاد رکھیئے یہ مقام نظام توحید کے مرکز کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ مقام ہے جو شرفِ انسانیت کا ماخذ ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے کہ جو کوئی اس مقام کی حدود میں آ جائے امن میں آ جائے گا۔ مطلب یہ کہ جو کوئی نظام الٰہیہ کو تسلیم کر کے اور ایمان لا کر قوانین خداوندی کے ماتحت آ جائے اسے از روئے اسلام سلامتی مل جائے گی۔ اسی لئے اس مرکز کو دنیا کے امن کا مرکز کہا گیا ہے۔

مکّے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم؟

رسم کعبہ

جس کعبہ کو خدا نے امن و سلامتی کا مرکز کہا ہے آج اس قبلہ کی حقیقت ہمارے نزدیک گہوارہ گئی ہے۔ کیا اسی حد تک نہیں کہ صرف اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لی جائے یا زیادہ سے زیادہ حج کی رسم ادا کر کے واپس لوٹ آئیں اور وہاں سے آب زمزم یا کھجوریں ساتھ لے آئیں حالانکہ قرآن

نے یہ بتایا تھا کہ توحید سے مقصود یہ ہے کہ خدائے واحد کی حاکمیت قبول کرنے والوں میں وحدتِ ملی پیدا ہو۔ اور وہی شے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری
جنگ سے زوال آیا تیری رگوں میں
نے گرمی افکار نہ اندیشۂ بے باکی

غرض فکر کا معیار یہ تھا کہ ہر قدم کے اعمال اسی میزان پر تولے جاتے تھے۔ اور اس مقام کا راز حرم کی تعمیر میں مضمر تھا۔ آبِ زمزم کو سر سے تعبیر کیا تھا کہ اس کی زندگی کی کھیتی اسی پانی سے سیراب ہوتی تھی۔ لیکن اب حضور کے پانی یہ تبرک بن کر رہ گیا ہے اور رگوں کی نگاہ [illegible] زیادہ ہیں ہے۔ اس کے تقدس [illegible] یہ کہ یہ کنواں [illegible] ہو کہ ساری دنیا اور تمام عالم اپنے تمام [illegible] کا [illegible] فیصلہ تمام فیصلوں پر غالب [illegible] فطرت کے فیصلے ہوتے۔

فطرت کے مقاصد کا نگہبان اس کے سوا کون ہے
[illegible] میزانِ قیامت میں کھرا ہے میزان

بنیاد و اصول

جب تک سیاست اور مذہب میں یکرنگی رہیگی اس ہم آہنگی کا نام دین ہوگا۔ جونہی اس سے سیاست الگ کرلیں دین منقسم ہو جائے گا یعنی پرستش خدا کی اور محکومیت انسانوں کی۔ اس شرک سے متنبہ کیا گیا تھا۔

اے پیغمبر سلام۔ سرزنش سے منہ موڑ کر اس نظام زندگی (اطمینان) کی راہ اپنا لو جو اس نصرت خداوندی کے عین مطابق ہے۔ جس پر خدا نے تمام نوع انسانی کو پیدا کیا ہے (یاد رکھو) خدا کی تخلیق میں کوئی کمی نہیں ہوا کرتی۔ یہی صحیح نظام ہے۔ لیکن اکثر لوگ واقف نہیں ہیں۔

سورۂ روم (۳۵/۳۰)

مسلمانوں میں سب سے پہلے تفریق دین کی تقسیم سے شروع ہوئی۔ ملوکیت کا زمانہ آیا۔ خلافت کا دور ختم کر دیا گیا۔ خلیفۂ وقت نے اپنا نام تخت و تاج رکھا اور یہ اشتراکیت کو بچانے کے لئے مذہبی پیروؤں سے بوڑھ مل کیا۔ مذہبی پیشوا حضرات کا قرب حاصل کر کے خود تو بادشاہ بن گئے ان شہنشاہوں نے پاسبان کا نام اختیار کیا اور اس سے اپنے قصور کو ڈھانپ لیا اور دین کا نام مذہب رکھ کر مذہبی پیروؤں کے سپرد کیا۔ ان پیروؤں نے سلطنت کی حفاظت و بقا کے لیے نظام خدا کو بدل دیا۔ کہ سیاسی معاملات اصولوں کو

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا
بشیری ہے آئینہ دار نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی داود شیری

قرآن اور شمشیر

انسانی فطرت بالخصوص اور فطرت بالعموم کوئی ایسا قانون تسلیم نہیں کرتی، جبتک قانون کے ہاتھ میں قوت و اقتدار کی شمشیر جوہر دار نہ ہو۔ قانون بے قوت صرف جذبات اور مفادات کا محض کھیل بن کر رہ جاتا ہے۔ قانون عملاً اس وقت نافذ نہ ہوگا جب تک حکومت کو اقتدار حاصل نہ ہوگا۔ قرآن نے اس قوت و اقتدار کو استخلاف کہا ہے۔

اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جنہوں نے ایمان قبول کیا اور نیک عمل کئے۔ یہ وعدہ کیا ہے کہ ہم ضرور بالضرور انہیں دنیا میں قوت و حکومت کا مالک بنا دینگے جس طرح ہم نے ان سے پہلوں کو قوت و شوکت عطا فرمائی تھی۔ اور ایسا ہی کیا ہے کہ ان کے لئے خدا اس دین کو ان کے لئے متمکن (صاحب اقتدار)

بنا دے گا۔ جسے خدا نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے۔ اور نیز ان پر خوف و زندگی کے بعد ان کی زندگی کو امن و سلامتی کی زندگی میں تبدیل کر دے گا۔ کیونکہ وہ لوگ میری ہی عبودیت (حکومت و اطاعت) اختیار کرتے ہیں۔ اور میرے ساتھ (میری اطاعت و حکومت میں) کسی دوسرے کو شریک نہیں کرتے۔ اور جس نے ان تمام باتوں کے باوجود انکار کی راہ اختیار کی تو درحقیقت یہی وہ لوگ ہیں جو فسق و فجور پھیلانے والے ہیں۔" (۲۴/۵۵)

گویا دین اُس اقتدار کا نام ہے جس میں حکومت صرف خدا کی اختیار کی جائے، کسی انسان کی اطاعت قبول نہ کی جائے اور نہ ہی کوئی انسان کسی قوت سے دوسرے انسانوں کو اپنے اقتدار کے سامنے جھکانے کا جواز رکھتا ہے۔ یعنی خدا کی حاکمیت میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ اس طرح دنیا میں قانونِ قرآنی کا نفاذ ہوگا۔ اور اس سے قرآن اور شمشیر میں ہم آہنگی ہوگی۔ اور وہ قوت و اقتدار دینے سے ہم کے بارے میں اللہ نے سورۃ انفال میں فرمایا ہے: کہ

"اور جس قدر بھی کے مقابلے میں تمہارے بس میں قوت سے پیدا کیے اور گھوڑے تیار کر کے اپنا سازو سامان مہیا کرنے رہو اس طرح تیاری کر تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رہو گے۔" (۸/۶۰)

[illegible] خدا کا [illegible] قانونِ خداوندی کے نافذ کرنے والے
[illegible] جلالی پیغمبر [illegible] نفاذ کرنے والے [illegible] قوت
[illegible] والے [illegible] کہ قوت و اقتدار کے ساتھ [illegible]
[illegible] اپنی جماعت کو [illegible] رہتے ہیں اور وہ امانت
[illegible] اللہ تعالیٰ نے ہمیں [illegible] امانت کے لیے ایسی منتخب کیا ہے [illegible]
[illegible] کی حفاظت کے جوہر بھی عطا فرمائے کیونکہ ہم اس اقتدار کے مالک نہیں ہیں
[illegible] یہی وہ فرق ہے کہ [illegible] قوت بھی ہے اور صاحبِ [illegible]
[illegible] اور [illegible] بھی۔ اپنی لوگوں کے متعلق خدا نے
سورۂ فتح میں فرمایا:

"محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ اس جماعت میں شامل ہیں وہ کافروں کے مقابلے میں سخت اور باہم نرم ہیں۔"

اس شدت اور نرمی کی ضرورت اس لیے ہے کہ اس کے بغیر قانون بنتا ہے جو کہ رہ جاتا ہے۔

تیغ خار و گل سے آشکارا
نسیم صبح کی روشن ضمیری
حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے
اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کا دوسرا نام ہوگا۔ سرکش اور استبداد دنیا میں اس وقت آتے ہیں جب دین و سیاست منقسم ہوتے ہیں۔

تاریخ اُمم کا یہ پیام ازلی ہے
صاحب نظراں، نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیل سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و خرد و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
بے دیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

خدا کا یہ نظام جس میں قوت بھی ہے اور سربراہی بھی، نظام مملکت اور دین فطرت کہلاتا ہے، اور یہ نظام فطرت انسانی کے تقاضوں کی تسکین کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے، اور تکمیل شرف انسانیت کا آئینہ دار ہے اس لئے یہ دین (مملکت) کا امانت کی سلامتی کا ذمہ دار ہے اور ساری دنیا کا دین ہے۔ اس کے سوا تمام وہ نظام خواہ ایران میں شخصی ہو یا حلقۂ فرنگ میں جمہوریت۔ باطل ہیں، اس لئے کہ ان کے ہر باطل نظام کی رو سے انسانوں کو انسانوں پر حکومت کا حق حاصل ہے اور انسان انسانوں کا محکوم بنا دیا کر لینے پر مجبور ہوتا ہے۔ جہاں فکری آزادی سلب ہو جاتی ہے"

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

ایک مذہب کو دوسرے مذہب پر غالب ثابت کرنے کے لئے تو مناظرے وغیرہ کافی ہو سکتے ہیں، لیکن ایک نظام مملکت کو دوسرے نظام سے بہتر ثابت کرنے کیلئے تو کسی اور ہی شئے کی ضرورت ہے۔

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ

نظامِ مملکت اور دینِ الٰہی میں منطق و فلسفہ کی لمبی چوڑی کہانیاں کلام و بیان کی قوالیاں۔ ذہنی دلائل کے مناظرے اور غیر فطری نعرہ کے مباحث کام نہیں دیتے، یہاں تو صرف وہ قانون کام دیتا ہے جس کے سامنے میں دنیا کو سامنے ملتی ہے اور عدل قائم ہوتا ہے۔

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تو نے
کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگر دار

اس بیت کا یہ مصرعِ اول ہے کہ جس میں پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار

مسیح کی منادی

"بہروا زنگ" کے لباس میں بیمس انگریز نسل کے لوگ ہندوستان آتے رہتے ہیں پچھلے گزشتہ سال میں یہاں انکا ایک گروہ کام کر رہا تھا۔ ان کی

[illegible] کی [illegible] فوج [illegible] ایک
[illegible] ایسے [illegible] کا [illegible]
قوم [illegible] کرتی [illegible] ایسے [illegible]
[illegible] آجاتا [illegible] کے [illegible]
[illegible] ہوا [illegible]
[illegible] کے [illegible]
[illegible] کے [illegible]
[illegible] کے

کے بعد اس مستن نے یہ تیر مارا کہ بچوں کو عیسائی بنا دیا اور تعداد گن کر
اپنے مرکز میں رپورٹ بھیج دی۔ اس طرح اس مستن نے متاع غیر پر نظر رکھی

متاعِ غیر پہ ہوتی جب نظر اس کی
تو پیش ہر دلِ لشکر کلیسا کے بخیر

یوم نجات

ندی کے اس پار جنگل تھا اس میں صرف بھیڑیے رہا کرتے تھے اور اس پار
کچھ بستی تھی جہاں صرف شیر رہا کرتے تھے۔ شیر ہر روز ندی پار کر کے بھیڑیوں
کے جنگل آ جاتے اور کسی نہ کسی بھیڑیے کو دبوچ کر لے جاتا۔ بھیڑیے ان شیروں کی
تیزی سے تنگ آ گئے۔ ایک دن ان میں مشورت ہوئی کہ شیروں کی نجات
کے متعلق سوچیں۔ کچھ عقل میں نہ آیا۔ آخر ایک بہت بڑے بھیڑیے کو
میں نے تم ایک کی بات کہنی ہے تم چاہتے ہو کہ تمہارے اندر بھی شیر
آ جائے تاکہ شیروں کا ظلم کم کر سکو۔ میں ظلم کا مزہ چکھا ہے۔ لیکن میرے
بھیڑیو! یہ تدبیر کارگر نہیں ہوگی۔ تمہاری طاقت میں خود شیر نہیں آ سکے گی۔
ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ شیر کی فطرت بدل جائے

بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رمِ آہو
باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ

بکری بالکل درندگی کے جامے میں جا نکلی گی اور پھر دیکھو بو نرا کرے۔ چنانچہ دوسرے روز وہ بڑی بکری گیروا لباس پہن کر شیروں کے بادشاہ کے حضور پہونچی۔ شیر نے درندگی صورت دیکھکر بڑی تعظیم کی۔ بکری نے نصیحت شروع کی اور کہا۔ بہادروں کے بہادر شیروں کے شہنشاہ! کبھی تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ یہ دنیا ایک سرائے ہے۔ یہ کسی کو ہمیشہ نہیں رہتا۔ زندگی پانی کا بلبلا ہے، اُس پر بھروسہ کیا۔ اس مختصر اور غیر بھروسہ زندگی کے لئے اقیت کیوں خراب کر رہے ہو۔ تمہیں تو چاہیئے کہ تم امن اور سلامتی کا مرکز بن جاؤ۔ یہ خونخواری اللہ کو پسند نہیں ہے۔ یہ ظلم ہے، استبداد ہے، کمزوروں اور نہتوں پر ستم ہے سراسر ناانصافی ہے۔ تم شیر ہو تمہارا فرض ہے کہ کمزوروں کی نگرانی کرو، تاکہ اُن کے خون اور گوشت سے اپنا پیٹ بھرو۔ پیٹ بھرنے کے لئے اللہ نے گھاس پیدا کی ہے۔ پیاس بجھانے کے لئے ندی کا ٹھنڈا پانی عطا کیا ہے ——— شیر اُس کی باتیں سنتا بار ہا تھا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ حیرانگی سے دیکھتی جا رہی تھی اور اپنی فتح مندی پر نازاں تھی۔ آخر شیر نے اُس کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور خونخواری سے توبہ کر لی۔ شیر اسی وقت تمام شیروں کو لا کر نصیحت کی کہ کل سے گوشت حرام ہو گیا۔ اس

جلال ہے ——— شیر دل نے بھیڑ کا شکریہ ادا کیا اور بڑے احترام سے رخصت
ہوئے۔ الوداع کہنے کے لئے آتے بھیڑیے اپنے جنگل میں پہنچے تو بھیڑیے اس کے انتظار
میں تھے۔ اس نے عقلمندی کی ساری داستان سنائی اور ساری الٹی سیدھی باتیں
بتا دیں ——— بالکل یہی حال انگریز نے ہندوستانی قوم سے کیا ہے جس نے ان کو
مسلمانوں کی تسبیح پر چھا کر دنیا کی زمام حکومت اپنے ہاتھوں سے دے دی۔

با وسعتِ افلاک بیں تسبیحِ مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیحِ دمادم
دو مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ ملا و جمادات و نباتات

ضربِ اقبال

ولایت سے انگریز کے بھیجے ہوئے پادریوں نے ہندوستان میں آ کر ایک طرف
بال بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ ان کی تعلیم اسلام پر تھی۔ انہوں نے آ کر ایک طرف
تو ہندو طبقہ کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کیا اور تعلیم کر کے ان کی ذہنی قوتوں کو
مناظروں میں الجھا دیا۔ دوسری طرف مسلمانوں کی فرقہ کو ہوا دی۔ تیسری جانب
آسمانی بادشاہت کے اصول کو بری طرح بدنام کیا۔ اس منظم پروپیگنڈا کا اثر

یہ ہوا کہ مسلمان جہاد کے معاملہ میں پادریوں کی باتیں کرنے لگے۔ ان کے رہنما قرآن پر چلتے تھے کہ اس میں جہاد کے متعلق آیات کیوں ہیں:

خود پرستی نہیں قرآں کو یہ لینے دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

ان پادریوں نے مسلمان کو عیسائیت کی تعلیم دی۔ لیکن جب سازش میں کامیاب نہ ہو سکے تو لالچ کے دروازے کھول دیئے۔ حکومت ان کی تھی روپیہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ ہندوستان میں برکات، بالخصوص مسلمان کی عام اقتصادی حالت بہت خراب تھی۔ کچھ لوگ تھے جو ان پادریوں کے اپنے جال میں پھنس گئے۔ اخبار دفتر دریا میں ڈال دیتا تھا۔ جب ان کی روٹی کا سوال ہو تو کیا دیکھا دیکھی اور پیٹ بھرنے کے علاوہ اس وقت اقبال نے آواز بلند کی:

حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات
اسلام کا محاسبہ یورپ سے ہو مرید

اس مرد حق نے ساری عمر حق آزادی کے لئے جدوجہد کی۔ جب اس کا وقت آ گیا۔ اس نے خود اپنا جنازہ اسلام کے غلاموں کے کندھوں پر اٹھایا

اور مغرب سے اس طرح روشناس کرایا:

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

اور اپنے نہایت ہی سادہ دل مسلمان کو زمانے کے نشیب و فراز سمجھاتے ہوئے فرمایا کہ ع

تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر

اپنے بیگانے

آخر میں سختی سے کہا کہ باہم اتحاد سے رہو، فساد نہ کرو، ذرا سا میں نہ منتشر ہو جاؤ، قبیلوں اور جماعتوں کی تفریق مٹا دو، صرف ایک مسلمان کہلاؤ، اسی قرآن میں حکم ہے کہ منتشر ہو جاؤ، آپس میں پھوٹ نہ ڈالو، کا مطلب یہ ہے اور اپنی طرف سے یہ بات قرآن کی تفسیر [illegible]

[illegible]

وطن ایک قبیلہ ایک خون ایک اور اُن کے آباؤ اجداد ایک تھے ـــــ یعنی ایک طرف حضرت ابوبکر تھے تو دوسری طرف ان کا بیٹا تھا۔ ادھر حضرت خدیجہؓ تھے تو اُدھر اُن کے باپ عقبہ تھا، اُدھر حضرت عمر تھے تو اُدھر آپکا ماموں تھا۔ ادھر حضرت علی تھے تو مخالف صف میں اُن کے بھائی عقیل تھے۔ ایک جانب حضرت محمد خود تھے تو مقابل میں آپ کا چچا حضرت عباس تھا۔ اور آپ کے داماد ابا العاص۔ ادھر ام المومنین حضرت سودہؓ تھیں تو سامنے ان کے عزیز سہیل بن عمر

آپ نے دیکھ لیا کہ ان دو صفوں میں جو لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، اُن کا باہم رشتہ کیا تھا! اس کے برخلاف حبش کا رہنے والا بلالؓ اپنا تھا۔ یہ پرایا اپنا تھا اور وہ اپنے قطعی پرائے۔ کیوں؟ قرآن اس حقیقت کبریٰ کا اعلان کر رہا تھا کہ انسانی تقسیم کا صحیح معیار کیا ہے؟ اس معاشی تقسیم کی وجہ ایمان تھی۔ اسی ایمان نے انھیں ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کر دیا تھا۔ یہ اس واقعہ نے اس حقیقت پر مہر لگا دی کہ لڑائی صرف اللہ کے لئے ہو سکتی ہے۔ اور جب ہمارے سامنے سبیل اللہ کا سوال آ جائے تو پھر انسانوں کے چہرے دیکھنا [illegible] دیکھنا مناسب ہے۔ لیکن آج ہماری اسلامی مملکت پاکستان [illegible] ہمارے لوگوں پر توجہ دی جا رہی ہے۔ قطعی یہ نہیں [illegible] کے لئے [illegible] آباؤ [illegible]

اہل بھی ہے یا نہیں لیکن ایمان والوں نے ایسا نہیں کیا۔ لوگ آج بھی اس شب کے خلاف واویلا کر رہے ہیں۔

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پروانہ ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

نبی نے اپنے لشکر کو مکہ سے نکال کر مدینہ میں اپنی پناہ میں لے لیا اور وہاں ان کی حفاظت کے سامان اور رزق کے سامان مہیا کر دیئے لیکن اصل مقصد تو یہ نہیں تھا کہ کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر محصور ہو جائیں بلکہ مقصد یہ تھا کہ طاغوتی قوتوں کی سرکوبی ہو جائے تاکہ دنیا میں دین الٰہی کا نفوذ ہو۔ اللہ نے اس مقصد کے حصول کے لئے مومنین کے بازوؤں میں فولادی قوت عطا فرما دی۔ جس سے انہوں نے سرکشی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک کر پیچھے ہٹا دیا۔ اس لشکر کو آزادی کی فضا میسر کی، کیونکہ یہ فضا اور رزق اسی قوم کے نصیب میں ہے۔ جو طاغوتی قوتوں کو سرنگوں کر آزادی کی فضا میں سانس لے۔ ورنہ غلامی کا رزق جسے اشرف الرزق کہا گیا ہے بدترین رزق ہے۔ ایسے رزق سے تو گلا گھونٹ کر مر جانا بہتر ہے کہ زہر آلود نان شیریں پر گزر ہو۔

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

شوکتِ عشق

جنگِ اُحد میں مسلمانوں کی طرف سے ستّر آدمی شہید ہوئے۔ مسلمانوں کے افلاس کا یہ عالم تھا کہ شہیدوں کے کفن کے لئے کپڑا بھی نہیں تھا۔ چنانچہ حضرت مصعب بن عمیرؓ کو اس طرح دفن کیا گیا کہ اُن کے پاؤں گھاس سے ڈھانپ دیئے اور سر پر کپڑا ڈالا گیا۔ دو دو شہیدوں کو ملا کر ایک ایک قبر میں دفن کیا گیا جسے قرآن زیادہ یاد ہوتا تھا اُسے مقدم کیا جاتا۔ ایک صاحب اجیرم کا نام سے مشہور تھے۔ زندگی میں مسلمانوں کے ساتھ احسان اور مروت سے پیش آیا کرتے تھے لیکن مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ بعض ایسا ان میں اسلام نہ تھے۔ اس جنگ میں انہیں جوش آیا اور اپنا لوہے کا ہتھیار لے کر میدان جنگ میں آ گئے اور مسلمانوں کی طرف سے لڑنے لگے حتیٰ کہ شہید ہو گئے۔ انہی کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے ایک وقت بھی نماز نہ پڑھی لیکن بہشت میں گیا۔

[illegible] ایک [illegible] کہ [illegible] تمام
[illegible] کو [illegible] تھا

خوگرِ حمد

قرآن کریم میں سورۂ توبہ میں ارشاد ہے:

"تاکہ کفار تمہارے اندر سختی اور صلاحیت محسوس کریں اور ان کے دلوں میں تمہارا رعب بیٹھ جائے۔"

قرآن نے یہ جماعت خوگرِ حمد یعنی جماعت مومنین کی حمد میں ارشاد فرمایا ہے یہ جماعت ایک دوسرے کے زخموں کے لئے مرہم، دل کی ٹھنڈک، آنکھوں کی تسکین۔ تمام محبت کے سلسلہ میں منسلک۔ ایک نصب العین ایک مسلک ومقصدِ حیات۔ ایک راہِ عمل۔ ایک متحدہ قوم۔ ایک کے دکھ میں سب کا دکھ ایک کے سکھ میں سب کا سکھ۔ اگر ایک کے پاؤں میں کانٹا چبھ جائے تو آنکھ سے آنسو چھلک آئیں۔ ایسا تعلق کہ جسد واحد معلوم ہوں۔ مظلوم کے لئے رحمت اور ظالم کے لئے عذاب۔

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

مصرا عجائب زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شجاعت اے محبت میں حریرِ و پرنیاں ہو جا

گذر جا بن کے سیلِ تند رَو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

خدا کی آواز

جب خدا کے لشکر نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو اُس وقت چاروں طرف تاریک مایوسیاں تھیں ظلمت انگیز نا اُمیدیاں تھیں۔ ان ظلمتوں کی تاریک راہوں سے یہ قافلہ چلا جا رہا تھا کہ ایک آواز اس بے سر و ساز و سامان اور عاجز کاروان کے کانوں تک پہونچی کہ

"اے پیروانِ دعوتِ ایمان) نہ تو ہمت ہارو، نہ غمگین ہو۔ تم ہی سب سے برتر و اعلیٰ ہو بشرطیکہ تم سچے مومن ہو۔" (۳/۱۳۸)

مظلومی و بیکسی، درماندگی و درچاری، ضعف و ناتوانی۔ نا اُمیدیاں اور مایوسیاں ایک لمحہ میں کامیابیوں اور کامرانیوں۔ تازگیوں اور شادابیوں۔ قوت و غلبہ اور شان و شوکت۔ جاہ و جلال اور دولتِ لازوال میں بدل گئیں جب کسی نے یہ کہا:-

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائیگی

اِس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائیگی

اور کبھی اس قافلے کو یادِ عزیز و اقارب نے خون کے آنسو رلایا۔ فطرت کے سامنے وہ گھڑی مسکرا رہی تھی جس گھڑی کے نصیب فتح مکہ میں نظمت مقدر کردی گئی تھی۔ مکہ جہاں اللہ کی تائید و نصرت کو جلوہ بار ہونا تھا۔ فطرت ان مایوس دلوں کو مسکراہٹ کی جاں بخش جھلک کے ساتھ پیامِ نصرت دے رہی تھی۔

آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس باد صبا ہو جائیگی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

اسلام میں زندگی کا تصور

ہندو مت میں ایک فرقہ ایسا بھی ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ کائنات کی ہر شے میں روح ہے حتےٰ کہ نباتات بھی احساس جان رکھتی ہے اسی نظریہ کے ماتحت انکا اصول ہے کہ ہر شے سے نرمی کا برتاؤ کیا جائے تاکہ اسے کسی قسم کا دکھ محسوس نہ ہو۔

لیکن اسلام اسکے برعکس نظریہ رکھتا ہے اسلام کے نزدیک ہر جاندار (علاوہ انسان کے) اور غیر جاندار صرف انسانی تصرف کے لئے عالم وجود میں لائی گئی ہے اور انسان کو اختیارات عطا فرما دئے گئے ہیں کہ وہ اپنی بصارت۔ بصیرت۔ ادراک اور ضروریات کے مطابق ان چیزوں سے کام لے کیونکہ انکے پہلو میں وہ شے ودیعت نہیں کیگئی جسکا نام زبان فطرت میں دل ہے۔ یہی وہ شے ہے جو زندگی کی کشمکش میں شریک ہو کر ارتقائے انسانیت کی منزلیں طے کرتی ہے اور یہ منزلیں طے کرکے انسان کو مقام زندگی پر جلوہ افروز فرماتی ہے۔ چنانچہ حضرت اقبال نے نباتات کو اسی نورِ بصیرت سے دیکھا ہے

تو شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں
اے گلِ رنگیں تیرے پہلو میں شاید دل نہیں
زیبِ محفل ہے شریکِ شورشِ محفل نہیں
یہ فراغت بزمِ ہستی میں مجھے حاصل نہیں
اس چمن میں میں سراپا سوز و سازِ آرزو
اور تیری زندگانی ہے گدازِ آرزو

یہ عالم جنات اپنی نمود اور ارتقا کے لئے محتاج ہے کہیں یہ دہقان
زیر بار احسان ہے تو کہیں چاند سورج کا محتاج ۔ کہیں منت کش
باد و باری ہے تو کہیں منت پذیر باغباں ۔ تقاضۂ فطرت ہے کہ
ہر شے اپنی حفاظت کی ذمہ داری دوسری قوت پر ڈال دیتی ہے پھر
اس سے ایک قسم کا اطمینان محسوس ہوتا جو دراصل موت کے مترادف
ہے زندگی کی جھلک نہیں ہوتی ۔ اور جو سراپا سعی پیہم میں محو و مستغرق
ہو گا زندگی یقیناً اس کے نیاز کے لئے بیتاب رہیگی ۔ اسی اطمینان کو
علامہ نے مطعون فرمایا ہے ۔

مطمئن ہے تو پریشاں مثلِ بو رہتا ہوں میں
زخمیِ شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں

اور اپنی سعی پیہم کو خوابِ جنت اور راہِ فردوس سے تعبیر کیا ہے

یہ پریشانی مری سامانِ جمعیت نہ ہو
یہ جگر سوزی چراغِ خانۂ حکمت نہ ہو

قرآن حکیم نے بنی اسرائیل کی نافرمان اور تن آسان قوم کو چالیس برس
تک میدانوں میں سرگرداں رکھا اور پھر نئی پود کو حکومت جیسا انعام
بخشا وہ اسلئے کہ اس پود میں حیاتِ آزاد کا تصور انگڑائی لیکر بیدار
ہو چکا تھا ۔ وہ پود سراپا سعی پیہم بنکر میدان عمل میں نکل اطاعت
موسیٰ قبول کر چکی تھی تو زندگی کی تلاش میں نکلی زندگی نے آواز دیکر
اپنی طرف بلایا ۔ یہی تلاشِ مستقل زندگی کی شمع فروزاں ہے ۔

یہ تلاشِ مستقل شمعِ جہاں افروز ہے
تو فقط ادراکِ انساں کو خرام آموز ہے

قرآنِ پاک نے شاعری کو ایسا ناثر کہا ہے جس سے انسانی تخیل کی کشمکش اور جد و جہدِ حیات برف کے تودے بنکر رہ جائے۔ قرآن کا یہ فیصلہ چونکہ خالقِ اکبر کا فیصلہ ہے لہٰذا اس میں کسی نکتہ چینی کی گنجائش ہی نہیں ہے لیکن قرآن کا یہ بھی فیصلہ ہے کہ ہر معاملہ میں سوچ بچار سے کام لو دانش جیسی نعمت اسی غرض سے دی فرمائی گئی ہے۔ چنانچہ جب ہم شاعری کی بحث میں اس حقیقت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو دنیا کی ایسی قومیں جنہیں شاعری اور محض شاعری سے ہی واسطہ رہا تنزل کی عمیق گہرائیوں میں تباہ حال نظر آتی ہیں۔ شاعری سے مراد ہر وہ تجویز ہے جس کے نقشے تو بنائے جائیں لیکن عملی طور پر وجود قائم نہ کیا جائے۔ اسی تن آسانی کا دوسرا نام شاعری ہے اسی تن آسانی کا دوسرا نام شاعر اور اسی تن آسان قوم کو شاعروں کی قوم کہتے ہیں۔

وہ شاعری جو زندگی میں عمل و حرکت کی روح پھونک دے شاعری نہیں اعجازِ مسیحائی ہے۔ وہ شاعر جو اپنے تخیل کی قوتوں سے قوم میں تازگی اور بیکری میں روح کار پیدا کر دے شاعر نہیں قوم ہے۔ ایسی ہی شاعری پیامِ حیات ہے۔ اگر نام

نغمہ نفرے شاعری وہ نثر ہے جو لے سے پڑھی جائے تو قرآن کو بھی خوش الحانی سے پڑھنے کا حکم ہے بلکہ ثواب ہے۔ اور نثرِ قرآن کی تنظیم و ترتیب اس انداز سے مرتب ہے کہ بہترین نظم معلوم ہوتی ہے۔ بعض آیاتِ مقدمہ میں تو قافیے ردیف تک موجود ہیں اور ان آیاتِ مکرمہ کو پڑھنے میں ایسا سرور ملتا ہے کہ سامعین کو بھی مسرت حاصل ہوتی ہے دراصل قرآن پاک نے ایسی شاعری کو جو انسانی زندگی کے قوئے کو شل کر دے ناجائز قرار دیا ہے تاکہ اسکے عمل سے قومیں مردہ نہ ہو جائیں اور حیاتِ اجتماعیہ میں تن آسانی نہ آ جائے۔ ورنہ ایسا شاعر جسکے نغمے سرمایہ حیات ہوں قوموں کے حق میں رحمت ہوتا ہے۔ حضرت علامہ نے بھی ایسے ہی شاعر کو مخاطب فرمایا ہے۔ ؎

خالِ تیری شوخی بربط سے ہے سرمایہ دار
جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار

تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کشتِ فکر سے اگتے ہیں عالم سبزہ وار

زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

قرآن پاک کے نزدیک زندگی کا مخرج حقیقتِ انسانیت ہے۔ اور مخرج انسانی حقیقت و کردار کے ارتقا کا دوسرا نام ہے۔ جب آدمی مادی

قوتوں کی تسخیر کے بعد شرفِ انسانیت کی منازل طے کر کے مقامِ بشریت تک عمل کرتا ہے تو وہاں پہنچکر اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ فی الواقعہ خلیفۂ ارض ہے اور پھر وہ اس ابرِ آزاد کی طرح ان تمام پستیوں سے بلند ہو کر فضائے کائنات پر چھا جاتا ہے جسکا مقام قیودِ مکانی سے آزاد ہوتا ہے۔ اور یہی حیاتِ مردِ مومن کی تفسیر ہے۔ علامہ فرماتے ہیں

ہے بلندی سے فلک بوس نشیمن میرا
ابرِ کہسار ہوں گل پاش ہے دامن میرا
کبھی صحرا کبھی گلزار ہے مسکن میرا
شہر و ویرانہ میرا بحر مرا بن میرا

جب ایسا مردِ مومن جسکے لئے سکوت حرام ہے تسکینِ جسم کے لئے لمحہ بھر کی خاطر راحت کا طالب ہوتا ہے تو کائنات کی آنکھیں بسترِ استراحت پر بچھ جاتی ہیں

کسی وادی میں جو منظور ہو سونا مجھ کو
سبزۂ کوہ ہے مخمل کا بچھونا مجھ کو

اس مردِ مجاہد کے حضور میں ہر ذرۂ کائنات ہدیۂ نیاز پیش کرتا ہے۔ دینا کی امامت اسکے سر پر کلاہِ حشمت رکھتی ہے۔ جب یہ آزادی و حیات کا علمبردار زندگی کے ساز پر نغماتِ الٰہی کی دھن الاپتا ہے تو ساری دنیا اسکی نوائے با نظر سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہو جاتی ہے۔ غلام آبادیاں اسکی راہ دیکھتی رہتی ہیں۔ جس راستے سے اسکا قافلۂ زندگی گذر جاتا ہے ظالموں سے سرمایۂ زندگی چھین کر مظلوموں میں بانٹ دیتا ہے۔ اگر یہ

اگر یہ امیر وقت کسی وادی سے خاموش گذر جاتا ہے تو وہ ناہول زندگی سے مایوس ہو کر موت کی آغوش میں سر رکھ کر سو جاتا ہے۔ ؎

دور سے دیدۂ امید کو نہ سانا ہوں
کسی بستی سے جو خاموش گذر جاتا ہوں

انسان میں وہ خصوصیات موجود ہیں جو قدرت کے معجزوں میں ہیں۔ انسان کے خزانے ان موتیوں سے معمور ہیں جن کی چمک سے دنیا نورانی ہوتی ہے کم و بیش خدا کی تمام صفات اسکے بنانے کے حمیر میں ودیعت کر دی گئی ہیں لیکن مستفید وہی ہوگا جو ان سے کام لیگا۔ اگر کوئی ناک بند کرلے تو پھول کی بو کا کیا قصور ہے اسکا دماغ معطر نہ ہو سکا اگر کوئی کان بند کرلے تو آواز و نغمہ کا کیا گناہ ہے اس اعلان سے آگاہ نہ ہو سکا۔ فطرت نے انسانی فطرت کو خوبیاں اور قوتیں عطا فرمائی ہیں ان سے بے نیاز ہو جانا اور باخبر ہونا دونوں انسان کے اختیار کی چیزیں ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ بھی آدمی تھے انہوں نے مردوں کو زندہ کرنے کی قوت سے کام لیا وہ قوت اسکے اختیار میں آئی اگرچہ وہ براہ راست من جانب اللہ تھی لیکن تھی وہ ایک قوت اور وہی قوت جو خود اللہ کی صفات میں شامل ہے۔ جب آدمی نسبت کی معرفت حاصل کر لیتا ہے تو پھر یہ اعجاز اسکی ذات کے محتاج ہو جاتے ہیں۔ ؎

چشمہ کوہ کی شورش قلزم میں ہے
اور پرندوں کو کیا موج زمزم میں ہے
سرمہ سبزہ کے کھرے ہوئے کہاں قم میں ہے
غنچہ گل کو دیا ذوق تبسم میں ہے

فیض سے میرے نمونے ہیں سیٹھوں کے
جھونپڑے دامنِ کہسار میں دہقانوں کے

قرآن پاک کی تعلیم نے دنیا کو یہ سبق دیا ہے کہ اپنی معاشرت میں بود و باش کو اتنی اہمیت نہ دی جائے کہ زندگی کا نصب العین بنکر رہ جائے۔ رہائش کی اہمیت جب حد سے تجاوز کرتی ہے تو انسان میں فطرتاً "تن آسانی" کا شعور پیدا ہوتا ہے اور جب یہ شعور بیدار ہو کر روزمرہ زندگی میں کارفرما ہوتا ہے تو پہلے یہ انفرادی طور پر انسانوں کے قوائے زندگی شل کرتا ہے پھر اجتماعی طور پر بیداری کے جوہر کو مٹا دیتا ہے۔ قوموں کی زندگی میں یہی سے تنزل کا باعث بنتی ہے۔ اس کے برعکس مجاہدانہ زندگی ہے۔ اس زندگی کے لوازمات تن آسانی کے سامان نہیں ہوتے بلکہ سیدھے سادے ڈھنگ ایک قلندرانہ انداز رکھتے ہیں۔ تکلفات سے بے نیاز ہو کر آدمی جد و جہد حیات میں سراپا سعی پیہم نظر آتا ہے۔ اسی سعی پیہم کا دوسرا نام حلال کی روزی ہے لیکن ہمارا سرمایہ دار طبقہ جو مزدور کی محنت پر جیتا ہے آدمی کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ یہ تاجر طبقہ سود کے سہارے زندہ رہتا ہے اور اس سانس لینے کا نام زندگی نہیں ہے۔ یہ تساہل اور تخاہل تن آسانی کی دلیل ہے۔ یہ تن آسانی بجائے عمل زندگی سے گریز کرتا ہے۔

ن نرم بچھونوں سے خدا مجھ کو بچائے
سو جائے کوئی ان پر تو پھر اٹھ نہیں سکتا

جب یہ تن آسان طبقہ نرم بچھونوں پر پڑ جاتا ہے تو واقعی ان میں سے صلاحیت کے جوہر ختم ہو جاتے ہیں۔ قرآن غلام قوموں سے مخاطب ہے کہ اپنے اندر صلاحیت پیدا کرو کیونکہ وراثتِ ارضی صالح قوم کے لئے ہے یہ صلاحیت جس کے متعلق قرآن کریم نے ارشاد فرمایا ہے سعی پیہم اور مستحکم ارادوں کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ چنانچہ بنی اسرائیل کی قوم نے جب تک یہ صلاحیت کے جوہر اپنے اندر پیدا نہ کر لئے وہ مستقل طور پر چالیس سال تک میدانوں میں سرگرداں رہی۔ اور جب ان میں صلاحیت پیدا ہو گئی اور وہ صالح بن گئے فطرت کا اٹل قانون انکی طرف جھک گیا۔ فرعون معاشی طور پر اس قدر خوشحال تھا کہ اسکی نظیر نہیں ملتی لیکن صلاحیت کے اعتبار سے وہ اندر سے کھوکھلا تھا اور جو درخت اندر سے کھوکھلا ہو وہ تند ہوا کا کب تک مقابلہ کر سکتا ہے آخر وقت کے تقاضے نے اس کا سر نخوت کچل دیا۔ ایسے ہی انسان جو اپنے تئیں امیر، خوشحال اور سرمایہ دار کہلاتے ہیں معاشی اعتبار سے وہ سوسائٹی میں بلند نظر آتے ہیں لیکن حقیقت ان کی اس پہاڑ سی ہوتی ہے جو گلہری کے مقابلے میں ایک چنگھاڑ تک نہ توڑ سکے۔ ۵

قدم اٹھانے کی طاقت نہیں ذرا تجھ میں
نری بڑائی ہے خوبی ہے اور کیا تجھ میں
جو تو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھ کو
یہ چھالیا ہی ذرا توڑ کر دکھا مجھ کو

قرآن مجید غلام ذہنیتوں کی تفسیر کیلئے بنی اسرائیل کیطرف اشارہ کرتا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کو فرعون کے پنجۂ استبداد سے چھڑا کر نکل آئے تو ان لوگوں نے اظہار تاسف کیا اور موسیٰؑ سے برملا کہا کہ ہم مصری لوگوں کی غلامی میں بہت آرام سے تھے وہ ہماری ہر ضرورت کے ذمہ دار تھے وہاں ہمیں بہت آسائشیں تھیں تم نے ہم پر ظلم کیا جو انکی غلامی سے چھڑا کر لے آئے ہو ——— دیکھا جائے تو یہ الفاظ انکی فطرت کے آئینہ دار نہ تھے بلکہ اس ذہنیت کے ترجمان تھے جو برسوں سے غلامی کی تہ میں رہ کر زنگ آلود ہو چکی تھی اور اسکے آئینۂ آزادی کے تمام جوہر چھپ گئے تھے۔

عین وہی تماشہ آج ہماری نظروں نے دیکھا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد مہاجرین میں سے زیادہ تعداد ان مسلمانوں کی تھی جو اس تقسیم کو اصولی طور پر غلط کہہ رہے تھے۔ ان میں ایسے بھی لوگ تھے جو قائدین ملت کو سرِ عام گالیاں سنا رہے تھے اور کہہ رہے تھے [illegible] آزادی جس کے بدلے میں وطن چھوٹا۔ عزیز [illegible] اقارب بچھڑے۔ دولت لٹ گئی۔ گھر ویران ہو گئے اور اب [illegible] چلے آئے ہیں۔ اور یہ بات [illegible]

رہے تھے کہ ہمیں واپس پہنچا دو۔ ہمیں اپنے گھروں کو جانے دو۔ ہمیں وہ وطن عزیز ہے۔ ہم آگے نہیں بڑھینگے۔ یہ پاکستان کی زینت ہمیں پسند نہیں ہے اسکی مٹی ہمارے کھیتوں کی مٹی سے نہیں ملتی۔ ہمارے ڈگر ڈھور ہمیں واپس بلا رہے ہیں۔ ہم ہندو کی حکومت میں رہینگے۔ ہم صدیوں انگریزوں کی حکومت میں رہے ہیں کونسا ہمارا ایمان خراب ہوگیا ہے۔ ہماری مسجدیں آزاد رہی ہیں ہماری خانقاہوں پر کوئی پابندی نہیں رہی پھر ہندو کی غلامی میں کیا ہرج ہے ہمت ہمارے گھر نہ چھڑاؤ۔ یہ طبقہ سخت واویلا کر رہا تھا اور فریاد بھیڑوں کی طرح کہہ رہا تھا۔ ؎

یہ چراگاہ یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا — یہ ہری گھاس اور یہ سایا
یہی خوشیاں ہمیں نصیب کہاں — یہ کہاں بے زباں غریب کہاں
یہ عزت آدمی کے دم سے ہیں — لطف سارے اسی کے دم سے ہیں
اسکے دم سے ہے اپنی آبادی — قید ہم کو بھلی کہ آزادی!
سو طرح کا جنوں ہے کھٹکا — واں کی گذران سے بچائے خدا!
ہم پہ احسان ہے بڑا اس کا — ہم کو زیبا نہیں گلا اس کا

قدر آرام کی اگر سمجھو
آدمی کا کبھی گلا نہ کرو

[illegible] اور انداز معاشرت کے بارے میں [illegible]

نہایت وضاحت سے فرما دیا ہے کہ وہ انسان جو فرعونیت کا تمدن لیکر جینا چاہتا ہے زیادہ عمر نہیں جی سکتا اس لئے کہ اسکی یہ زندگی فطرتِ صحیحہ کے خلاف ہے آدمی کو مخلوق پر شفیق ہونیکی تلقین کی گئی ہے اسی نظریہ مصلحت کے ماتحت انسانوں کو انفرادی زندگی سے منع فرما کر اجتماعی زندگی کی ہدایت کی ہے تاکہ جماعت میں داخل ہو کر ہر انسان ایک دوسرے کے لئے اس طرح باعثِ رحمت بنجائے جیسے جسم کا ایک ایک عضو۔ جب انسان کائنات پر شفقت کی تمنا کرتا ہے تو اس کا ہیجان جذبات اس طرح زبان پر آجاتا ہے۔ ؎

دور دنیا کا میرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے
ہو میرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
زندگی ہو میری پروانے کی صورت یارب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب
ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

وہ انسان کائنات کے لئے باعثِ رحمت ہے جو دوسروں پر شفقت کی آرزو رکھتا ہے اور جو ظالم بنکر دوسروں کی خوشیاں چھین کر اپنی [illegible] چاہتا ہے وہ بھیڑیا ہے۔ درندہ ہے۔

وحشی ہے اور نالہ ہے۔ اس سے بہتر ایک ننھا سا کیڑا ہے وہ جگنو جو اندھیرے میں دوسری مخلوق کے لئے اجالا بنجاتا ہے اس انسان سے کہیں بہتر ہے جو اجالے میں اندھیرے کا سامان پیدا کرتا ہے۔ ؎

پہنچوں کس طرح آشیاں تک ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
سنکر بلبل کی آہ و زاری جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری
میں راہ میں روشنی کروں گا

جس طائر کی فطرت آزاد ہو وہ قفس نہیں ہوتی وہ ایک لمحہ بھی کنج قفس سے مانوس نہیں ہوتا لیکن ایسی روح جسکا بچپن ہی قفس میں گذرا ہو وہ آزاد فضا کی وسعت سے کیونکر باخبر ہو سکتی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں پرندے پالتو چکور بسیار کے پیچھے پیچھے پنجرے کے تعاقب میں کتناں کتناں پیچھے جا رہے ہوتے ہیں۔ اور یہ آزاد فضا انکے لئے وبال جان ہوتی ہے وہ اس کھلی فضا کو نئی دنیا سمجھتے ہیں حالانکہ یہی دنیا انکی فطرت کی دنیا ہوتی ہے لیکن غلامی کے زنگ سے جوہر فطرت دب چکا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مرغ گرفتار کی حالت بھی دیکھی ہے کہ وہ قفس میں کیڑ اڑاتا ہے۔ لوہے کی سلاخوں سے ٹکراتا ہے۔ اس کوشش میں اسکے پر بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ اس کی جسم

نازک بھی زخمی ہو جاتی ہے۔ یہ سعیِ مستقل اسے تھکا دیتی ہے لیکن کوئی قوت اسکی آزاد روح کو تھکا کر خاموش کر دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتی وہ دم لیکر پھر تازہ دم ہوتا ہے اس کی یہ تڑپ اس وقت تک بیدار رہتی ہے جب تک اسکی فطرت زنگ آلود نہیں ہوتی۔ ؎

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے
دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے

جب قوموں میں صالحیت آجاتی ہے تو انکے ارادوں کو دو نگہ تک نہیں آتی وہ سعیِ پیہم میں راحت اور جستجوِ مسلسل میں عشرت کا لطف لیتی ہیں کیوں کہ اسی جد و جہد مستقل میں فتح و ظفر مندی مضمر ہوتی ہے یہی وہ مقام ہے جہاں ان کے اقبال کے ستارے چمکتے نظر آتے ہیں۔ عمل اور پیہم عمل ان کی رگ و پے میں اس انداز سے سما جاتا ہے کہ وہ کسی ایسی تبدیلی حیات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتیں جس میں تن آسانی کے سامان ملیں۔ حتیٰ کہ وہ موت کے بعد کی زندگی کو بھی آرام و راحت کی نظر سے قبول نہیں کرتیں۔ یہ آزاد قوم موت سے پوچھ لیتی ہے کہ ؎

جستجو میں ہے وہاں بھی روح کو آرام کیا؟
واں بھی انسان ہے قتیلِ ذوقِ استفہام کیا؟

خرد مندی۔ ذہانت۔ اندیشہ۔ فکر اور نگہِ دوررس کا دوسرا

نام عقل ہے یہ قوت ہر فطرت کو عطا ہوئی ہے اس کائنات میں ہر جاندار اسکے ماتحت اسکی بخوز دراہوں پر گامزن ہے۔ لیکن آدم کو اس کے مطیع بھی رکھا ہے اور اس پر حاکم بھی۔ زندگی کے بعض تقاضے اکثر مقامات پر خرد کو خاموش رہنے کی تلقین کرتے ہیں اور وہاں عقل کو بھی لازم آتا ہے کہ خاموش ہو جائے ورنہ یہی عقل فساد و شر کا سبب بنکر رہ جاتی ہے ان راہوں میں صرف دل کی روشنی رہنما ہوتی ہے عقل کا چراغ اس منزل میں رہبری نہیں کرسکتا چنانچہ علامہ اقبال کا یہ مقالہ عقل و دل کی تفسیر ہے۔

عقل نے ایکدن یہ دل سے کہا — بھولے بھٹکے کی رہنما ہوں میں
عقل ہوں زمیں پہ گنہ فلک پہ مرا — دیکھو تو کسقدر رسا ہوں میں
کام دنیا میں رہبری ہے مرا — مثلِ خضرِ خجستہ پا ہوں میں
ہوں عنصر کتابِ ہستی کی — مظہرِ شانِ کبریا ہوں میں
ہوں نہ اک جون کی ہے تو لیکن — غیرتِ لعلِ بے بہا ہوں میں
دل نے سنکر کہا یہ سب سچ ہے — پر مجھے بھی تو دیکھ کیا ہوں میں
زندگی کو تو سمجھتی ہے — اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
تب کچھ واسطہ مظاہر سے — اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے — تو خدا جو۔ خدا نما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بیت نبی — اس مرض کی مگر دوا ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مقام مرا
عرشِ رب جلیل کا ہوں میں

قرآن پاک نے فرمایا ہے کہ ہمنے زمینوں کے اندر علوم و فنون کے خزانے دفن کر رکھے ہیں انسان انہیں کھود کر اپنے استعمال میں لائے۔ آگ ہوا پانی اور برق و باران میں بھی طاقتیں پوشیدہ ہیں جو علم کے ذریعہ انسان کے اختیار میں آسکتی ہیں۔ یہ چیزیں اس وقت تک مردہ ہوتی ہیں جب تک اپنی جگہ پر قائم رہیں لیکن جونہی انسان کے ناخنِ تدبیر نے کریدنا شروع کیا ان میں زندگی کے جوہر بیدار ہونے شروع ہو گئے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ محتاجِ تدبیرِ انسان ہے۔ یہ معمور خزانے رہینِ تجسس نہیں۔ یہ خاموش قوتوں کے بے پناہ خزانے آدمی کے منت پذیر ہیں کہ انہیں حرکت دیکر زندگی عطا فرمائی جائے۔ آدمی نہ ہو تو یہ تمام مادہ قوتیں بیجان و بے روح ہیں۔ قرآن خود ایک سائنس ہے۔ اور یہی سائنس مادہ دنیا کی روح ہے۔ ؎

قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے
ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے
ہر شے کو تیری جلوہ گری سے ثبات ہے
تیرا یہ سوز و ساز سراپا حیات ہے

وہ انسان جو فطرت کا کامل آئینہ ہو اور اپنے اندر نورِ الٰہی کی جھلک تک محسوس نہ کرے بینا نہیں نابینا ہے۔ آگ کا یہ احساس کہ اسکے اندر جلانے والی قوتیں مضمر ہیں اسے گرم رکھتا ہے۔ سیماب کا جوہر سیمابی

نہ ہو جائے تو اس کے قلب کی حرکت بند ہو جائے۔ زندگی کا یہ احساس ہی اُسے ہر وقت بیتاب رکھتا ہے۔ وہ شمع جو بظاہر روشن ہو لیکن اس روشنی کے نور کو اپنے سینے میں منور نہ پائے روشن نہیں تاریک ہے ؎

تو جل رہی ہے اور تجھے کچھ خبر نہیں
بینا ہے اور سوزِ دروں پر نظر نہیں

لیکن وہ انسان جو اپنی خودی سے واقف ہے یوں خاموش نہیں جلتا۔ ؎

یہ آگہی میری مجھے رکھتی ہے بیقرار
خوابیدہ اس شرر میں ہیں آتشکدے ہزار

قرآن پاک نے ہر اس زندگی اور زندگی کے شعبے کو مردہ کہا ہے جو جد و جہد سے گریز کرے۔ اس گریز کا دوسرا نام تن آسانی ہے۔ دنیا میں ایک فرقہ ایسا ہے جو جد و جہد سے کنارہ کش ہو کر راہبانہ زندگی کا طالب ہے۔ یہ راہب فرقہ عیسائیت نے پیدا کیا ہے۔ ان کے بعد ہندو مت نے اس خیال کو اپنایا اور جوگیوں، بیرو بیپ دھاری جنگلوں میں رہنا شروع کیا۔ یہ راہب اور جوگی ایک ہی خیال کی دو کڑیاں ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ اگر وصال الٰہی کی آرزو ہو تو انسان دنیا کی محفل سے الگ ہو کر گوشۂ تنہائی میں عبادت کرتا ہے۔ ان کے ہاں عبادت کے بھی مختلف طریق ہیں۔ کوئی برسوں بازو اٹھا رکھتا ہے کوئی ٹانگ۔

اس طرح اپنا تندرست عضو جسم بیکار بنا کر دنیا پر ظاہر کرتے ہیں کہ ہم مہا بھگت ہیں اور پرماتما کے درشن کر چکے ہیں۔ یہ ایک فریب ہے جس میں وہ مستقل طور پر مبتلا رہتے ہیں اور دنیا پر اپنی کمزوری ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ اسلام کے نزدیک یہ تنہائی کی زندگی درست نہیں ہے۔ اسلام اسکی اجازت نہیں دیتا کہ حیاتِ اجتماعیہ سے رشتہ منقطع کر کے گوشۂ تنہائی میں بے مقصد اور بے نصب العین تمام فرائض کو بھلا کر پڑے رہو۔ اللہ کو یہ عبادت پسند نہیں ہے۔

اللہ نہیں چاہتا کہ ایسے لوگوں کے ان خیالات کو تقویت دیکر عام کیا جائے۔ ؎

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب — کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا — ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری — دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
آزاد فکر سے ہوں عزلت میں دن گذاروں
دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو

قوم کے افراد جب انفرادی زندگی کو ختم کر کے حیاتِ اجتماعیہ کے دائرہ عمل میں داخل ہوتے ہیں تو انکی حیثیت اس قطرہ کی سی رہ جاتی ہے جو دریا میں گم ہو کر بظاہر فنا ہو چکا ہو۔ اس اجتماعی زندگی کا ایک نصب العین ایک پالیسی ایک نظام۔ ایک امیر یا قیادت۔ اور ایک پرچم ہوتا ہے۔ افراد کی

ضابطہ اجتماعی پر دے میں اس طرح چھپ کر رہ جاتی ہیں کہ دیکھنے والے ان کے وجود کو چھو بھی نہیں سکتے۔ سوسائٹی کا کوئی قانون جماعت کے ایک فرد کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکتا۔ ہر عمل جماعت کا عمل ہوتا ہے اور ہر حرکت جماعتی حرکت ہوتی ہے۔ یہ افراد کچھ اس انداز سے ہم آہنگی اختیار کر جاتے ہیں کہ جماعت کی مجموعی تکلیف کو ہر فرد اس طرح محسوس کرتا ہے جیسے سارے جسم میں کانٹا چبھ گیا ہو۔ ؎

شعلہ آجائے ہوا سے گل کی پتی کو اگر — اشک بنکر میری آنکھوں سے ٹپک جائے اثر

دل میں ہو سوزِ محبت کا وہ چھوٹا سا شرر — نور سے جسکے ملے رازِ حقیقت کی خبر

شاہدِ قدرت کا آئینہ ہو دل میرا نہو

مرتبہ جو ہمدردیِ انساں کو ملے سو وانہو

اور جب یہ اجتماعی نظام منتشر ہوتا ہے اور اس حیات اجتماعیہ کے تار و پود بکھر کر انتشار اختیار کرتے ہیں تو اس جماعت کے افراد کی حالت ایسی ہی ہوتی ہے جیسے ہوا کے جھونکوں میں کم زور تنکے۔ وہ فرد جو اجتماعی زندگی میں فرد سے زیادہ مضبوط اور چٹان سے زیادہ مستحکم تھا شاخِ شکستہ کی شکل اختیار کر جاتا ہے جماعت پتیوں کے اجتماع کا دوسرا نام ہے اور پتیوں کے اجتماع کا دوسرا نام پھول ہے۔ اگر یہ پتیاں بکھر کر منتشر ہو جائیں تو کوئی زبان اس انتشار کو پھول کے نام سے نہیں پکارے گی۔ عین یہی حال قوموں کا ہوتا ہے۔ قوم کی شیرازہ بندی جب افراد کی

شکل اختیار کرتا ہے تو دنیا اسے قوم کے نام سے نہیں پکارتی" یہی انتشار اسکا زوال ہے اور وہی اجتماع اس کا عروج تھا۔ ؎

کس زباں سے اے گلِ پژمردہ تجھ کو گل کہوں
کس طرح تجھ کو تمنائے دلِ بلبل کہوں
میری بربادی کی ہے چھوٹی سی اِک تصویر تو
خواب میری زندگی تھی جس کی ہے تعبیر تو

لیکن یہ فکرِ ملت بھی جو درحقیقت ایک نعمت ہے اُس وقت ذہنِ انسان میں انگڑائی لیتا ہے جب صالحیت بیدار ہو چکی ہو۔ جب قوم آزاد ہو۔ جو قوم زمین کی مالک نہیں ہے وہ تقدیر کی مالک بھی نہیں ہے۔ ایسی محکوم قوم اگر فکرِ ملت کا تصور بیدار کر بھی لے تو حکومت کا قانون اور حاکم کا استبداد تصورِ آزادی کا سر کچل کر رکھ دیگا۔ اس منزل میں سعیِ پیہم ہی کام آتی ہے۔ یہ سعیِ پیہم حاکم وقت کی نگاہ میں بغاوت کا کانٹا بن کر کھٹکتی رہتی ہے۔ لیکن جن قوموں کے فکر کے خزانے نور سے معمور ہو گئے ہیں وہ آزادی کی راہ میں تمام مصیبتوں کا مقابلہ کرتی رہتی ہیں۔ اور جس قوم کا شعور اور فکر مر چکا ہو اسے کوئی ضرب بیدار نہیں کر سکتی۔ قوم وہی زندہ ہے جس کی اجتماعی زندگی میں فرقہ بندی کا زہر پرورش نہ پا رہا ہو۔ سیاستِ حاضرہ کا اعلان ہے کہ اگر کسی قوم کو ختم کرنا مقصود ہو تو اُس کے اندر ایسا انتشار پیدا کر دو کہ وہ فرقوں میں تقسیم ہو جائے کیونکہ یہی وہ منزل ہے جس میں قومیں بہہ گئی ہیں۔ ؎

وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لئے اپنی زبان
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں

اگر بدبختی سے کسی قوم کا شیرازہ کسی کرشمہ باطل کے اعجاز سے منتشر ہوگیا ہو اور وہ فرقوں میں منقسم ہوکر اندرونی خلفشار کی رو میں بہہ کر راہِ بہبود کو چھوڑ بیٹھی ہو تو اس وقت قائدینِ ملت کا فرض ہے کہ اپنی تمام قوتیں پھر سے شیرازہ بندی میں صرف کر دیں۔ بہت ممکن ہے کہ اس چراغِ حق کو بجھانے کے لئے مخالف ہوائیں تیز رفتار ہو جائیں مگر ؎

غرضِ مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے
نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے

اور پھر قومی شاعر کا فرض اولیں ہے کہ اپنے کلام میں وہ جادو پیدا کرے جس سے مردوں کی روح بیدار ہو جائے۔ ؎

ہو اگر ہاتھوں میں تیرے خامۂ معجز رقم
شیشہ دل ہو اگر تیرا مثالِ جامِ جم
پاک رکھ اپنی زباں تلمیذِ رحمانی ہے تو
ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا لے آبرو
سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے
خرمنِ باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

قرآنِ پاک میں موت کے متعلق نہایت وضاحت سے ارشاد ہے کہ ہر شے پر موت لازم ہے ہر زندگی کو موت آئیگی۔ اور یہ نظام یہ انتظام عالم جب اس کی تکمیل ہو جائیگی تو ختم ہو جائے گا۔ پھر اسے ختم کرنے کے بعد دوسرا نظام شروع ہوگا۔ موت کا تاثر اور نتیجہ چونکہ خاتمہ ہے اس لئے اکثر مخلوق خدا اس کے تاثر سے متاثر ہو کر کاروبارِ حیات میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتی۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ دنیا فنا کا مقام ہے کوئی بشر وقت سے آگاہ نہیں ہے پھر سلسلہ حیات کو اہمیت کیوں دی جائے زندگی کا انحصار گنتی کے دنوں پر منحصر ہے اور یہ گذر ہی جائینگے پھر تکلف کیا! لیکن اسلام اس تخیل کے خلاف تعلیم دیتا ہے وہ انسانوں کو اور قوموں کو موت سے بے نیاز کر کے مجاہدانہ زندگی کی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام میں موت سے کھیلنے اور موت پر غالب آنے کا نام زندگی ہے۔ جو قومیں موت سے کھیلتی ہیں موت انکا احترام کرتی ہے جو موت سے بے نیاز ہو جاتی ہیں موت انکی زندگی کو چھو نہیں سکتی۔ اور ایسی ہی مجاہد قوم سے موت لرزتی ہے۔ ؎

اڑاتی ہوں میں رفتِ ہستی کے پرزے
بجاتی ہوں میں زندگی کا ستارا
میری آنکھ میں جادوئے نیستی ہے
پیامِ فنا ہے اسی کا ستارا

لیکن جب یہ طوفانِ فضا اپنی پوری قوتوں کے ساتھ بل کھاتا ہوا کسی مردِ مومن کے سامنے جاتا ہے تو اسکی تمام سرکشی سجدہ ریز ہو جاتی ہے۔ اسکی ساری بیباکی سرنگوں ہو کر اطاعت کا اقرار کرتی ہے۔ موت نے مجاہدوں کے حضور میں اپنی بے بسی کا اعلان کیا ہے۔ ؎

مگر ایک ہستی ہے دنیا میں ایسی
وہ آتش ہے میں سامنے اسکے پارہ

تاریخ عالم بالعموم اور تاریخ اسلام بالخصوص اس حقیقت کا اعلان کرتی ہے کہ جب بھی قوموں پر کوئی افتاد پڑی قوموں کے شعراء نے حرارتِ سخن سے تنزل اور بزدلی کے وجود کو پگھلا کر نابود کر دیا۔ اکثر اوقات انکی شاعری قوموں کے اقبال کا ستارا بنکر چمکی اور قوم کو تنزل کی عمیق گہائیوں سے اٹھا کر عروج و سطوت کی بلندیوں تک لے گئی۔ ؎

قوم گویا جسم ہے افراد ہیں اعضائے قوم
منزلِ صنعت کے وہ پیما ہیں دست و پائے قوم
محفلِ نظمِ حکومت چہرہ زیبائے قوم
شاعرِ رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم
مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

فطرت سے بے نیاز ہو کر زندگی کی راہوں پر چلنے کا وہ صحرا نام جہالت یا کم نگاہی ہے۔ ورنہ کائنات میں ذرہ سے آفتاب تک ہر شے اپنے اندر خزینۂ اسرار لئے ہوئے ہے۔ ہر چیز میں زندگی کے راز مضمر ہیں اگر کوئی صاحب بصیرت نظر سے کام لے تو اسے دریا کی بیتاب موجوں کی بیتابی کے بعد معلوم ہو سکتے ہیں ورنہ بظاہر یہ ہل چل فضا کی حرکت کی دلیل ہے۔ کون جانتا ہے کہ موج ساحل سے ٹکرا کر کیوں تڑپ جاتی ہے اور کونسی جستجوئے مسلسل، سعیِ مستقل کے لئے سرگرم عمل رکھتی ہے۔ دیکھنے والی نگاہ اور سمجھنے والا شعور ہو تو موج کی نوائے خفیف کا مفہوم سطح پر ابھر کر آجائے۔ ؎

زحمتِ تشنگیِ دریا سے گریزاں ہوں میں
وسعتِ بحر کی فرقت میں پریشاں ہوں میں

جو صاحب نظر بیتابی موج کی حقیقت سے روشناس ہو جائے پھر اس کا فرض ہے کہ دوسروں کو بھی اپنی نگاہوں سے وہ حقائق پنہاں دکھائے جس کے نظارے سے اسکی تلاشِ مسلسل کو سکونِ روح حاصل ہوا ہے۔ کیونکہ ہر آنکھ اس تماشے کو نہیں دیکھ سکتی۔ دیکھ کر دیکھ لینا صاحب بصیرت کو ہی نصیب ہے۔ ؎

علم کے حیرت کدے میں ہے کہاں اسکی نمود
گل کی پتی میں نظر آتا ہے رازِ ہست و بود

[illegible] سے اس راز سے آگہی حاصل کی اور اپنا فیض عام کیا ؎

کچھ جو سنتا ہوں تو اوروں کو سنانے کے لئے
دیکھتا ہوں کچھ تو اوروں کو دکھانے کے لئے

بے شک ہیں وہ شخص شاعر نہ عام نقطۂ نظر سے صرف شاعر [illegible] صدائے قلب کو ایسے شاعرانہ اظہار بیان کے لئے مقصود [illegible] کو ایک تصویر جیسا پیش کرتے ہیں انہیں بحر و عروض یا قافیہ ردیف [illegible] پابندی سے غرض نہیں ہوتی ۔ ؎

طعنہ زن ہے کہ شیدا کیوں غزلوں کا ہے یہ
یہ ایک اسے دل ربا کی بزم اقدس ہے یہ
مجھے راز دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

[illegible] شاعری [illegible] نسبت کی [illegible] کیونکہ [illegible] کی [illegible] ہے [illegible] شاعری کو برائے [illegible] کے [illegible] ہے ۔ ان کا نصب العین [illegible] سے خالی [illegible] تھا [illegible] ہے [illegible] کر دیا جاتا ہے ۔ اس [illegible] ہے [illegible] کا [illegible] سے تعبیر کیا ہے اور اب سنئے ؎

[illegible]
[illegible]

چونکہ مذہب ان لوگوں کو اس پرستش کی حدود میں جکڑ کر رکھتا ہے اور دین ان رسیوں کو کاٹنے کا حکم دیتا ہے اور دین ہے علم و دانش کا تقاضا۔ دراصل اس تقاضے کا دوسرا نام ہے دین۔ لہٰذا جو قوم دین سے ہم آہنگ ہوگی وہ محبوبِ فطرت ہوگی۔ ؎

یہی آئینِ قدرت ہے یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن۔ محبوبِ فطرت ہے

ایسی قومیں جنکی زندگی بے روح ہو کر از سرِ نو صالحیت کے احساس سے سرد لہو کو حرارت عطا فرماتی ہے وہ اپنے تنزل سے ابھر کر عروج تک پہنچنے کے لئے اپنے ارادوں کو سہاروں کی رہینِ منت نہیں بنایا کرتیں ؎

پھرا کرتے ہیں مثلِ روحِ الفت فکرِ درماں میں
یہ زخمی آپ کر لیتے ہیں پیدا اپنی مرہم کو

اس حساس قوم کے شاعر بے معنی باتیں کرنے میں اپنا وقت ضائع کر کے قوم کو شاعری کے بھاؤ میں الجھا کر نہیں رکھتے بلکہ انکا دل اپنی ملت سے متاثر ہو کر فلاحِ قوم کی تدبیر میں مستغرق رہتا ہے۔

تڑپا دیدہ گریاں وطن کا نوحہ خوانی میں
حیاتِ چشم شاعر کی ہے سرمایہ بینائی

یہ شاعر قوم کو آزادی کی زندگی کی تعلیم دیتا ہے وہ شاہد

فطرت کے اشاروں سے زندگی کے نغمے کھینچتا ہے اور معراج خودی، چراغ روشن کر کے بقائے دوام کی راہ دکھاتا ہے۔ اور کبھی زندگی گذارنے کے انداز اس اسلوب میں بیان کرتا ہے۔ ؎

یہ سنتا ہے پانی میں نگوں رکھتا ہے سائل کو
تجھے کیا چاہیئے مثلِ حباب آبجو رہنا

کبھی وہ تاریخ کے اوراق پارینہ الٹتا ہے اور انتشار ملت کے نتائج کو تباہی و بربادی کے سانچوں میں ڈھال کر پیکر ذلت کے نقوش میں ظاہر کرتا ہے۔ کبھی وہ فقروں کی انفرادی زندگی دکھاتا ہے اور کبھی اس انفرادیت کو بحر بے پایاں کی شکل میں پیش کرتا ہے اور اس قسم کی مثالوں سے قومی زندگی کی وضاحت کرتے ہوئے زندگی کے نقطہ کو یوں بیان کرتا ہے۔ ؎

تجھ سے تو ہے پانی بے شناسا قوموں سے
کیا ہے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے

جو قومی زندگی میں شامل ہو کر اپنی ہستی کو قطرے کی طرح ختم نہ [illegible] کر اپنا وجود ہی نہ سمجھے اپنے وجود اور اپنی شخصیت کو [illegible] خود دار کی سب سے بہت بڑی جوہر سمجھے جب تک [illegible] یہ جوہر خود دار پیدا حاصل نہیں کرتا شاعر اس کی نظر میں [illegible] شخصیت کا نشان نہیں کر سکتا۔ تنہا چاند ان کہتے شاعر

اور انکی بے شمار منور کرنوں میں بھی نمایاں طور پر اپنا وجود رکھتا ہے

زندگی کی رو میں سرگرداں ہے تو حیراں ہوں میں
تو فروزاں محفلِ ہستی میں ہے سوزاں ہوں میں

لیکن یہ تمام چیزیں نائب تقدیر ہیں۔ چاند کے اختیار میں یہ نہیں ہے کہ وہ ہر رات کو اپنی روشنی عطا کرتا رہے۔ ستاروں میں یہ قوت نہیں ہے کہ جس رات کو چاند نہ ہو وہ اپنی روشنی سے فضا کو منور کر دیں۔ سورج کے بس میں یہ نہیں ہے کہ شام کے بعد صبح تک ایک لمحہ کے لئے بھی رات کو نور عطا فرما سکے۔ لیکن انسان کے بعض قدرت میں ہے کہ وہ کائنات کا ہمدرد ہو جائے۔ دوسری مخلوق کی خدمت اور نگرانی کا ذمہ دار بنجائے۔ بنی نوع انسان کے لئے اپنے اندر خدائی صفات پیدا کرے۔

ہر کہ در راہِ محبت ہمدم و ہمراز اوست
در دو عالم سرخرو و شاد و پیروز اوست

جب تک حقیقی رسول اللہ کی تہذیب اور زبان مصطفےٰ کی خلش سینے میں اندر چٹکیاں نہ لے کر جیسا۔ جو مسلمان ایک ملی کے دعویٰ زیادہ میں سب [illegible] ہی ہے [illegible]

[illegible] تمام عبادت ہے اور اس خلش اندروں کا نام بندگی ہے۔ یہی ذوق دید حضرت بلالؓ کی نماز بنگئی تھی۔ ؎

دلے دید سراپا نیاز تھی تیری
کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری

اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی
نماز اسکے نظارے کا ایک بہانہ بنی

نہ تھا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا
نہ تھا وہ دور کہ دیدار عام تھا اس کا

انسان اپنی زندگی میں کسی مقام کو بھی مقام سکون فرض کر لے تو ٹھیک وہ مقام اسکی موت کا مرکز بنجاتا ہے۔ اس سے کہ سعی پیہم وہاں پہنچکر خاموش ہو جاتی ہے۔ شوق مر جاتا ہے جستجو [illegible] ہو جاتی ہے۔ [illegible] تغیر پسندی تڑپ سو جاتی ہے۔ اندر [illegible] کا خاموش ہو جانا متاع حیات کا لٹ جانا ہے۔ لیکن [illegible] مومن اس متاع عزیز کی ہر لمحہ نگہبانی کرتا ہے اور وہ [illegible] اپنی نظر کے سامنے ہمیشہ [illegible] آتا ہے۔ ؎

[illegible] کی غربت کی داستان ہے
[illegible] ہمیشہ جہان الیس [illegible]
[illegible] کی طبیعت [illegible] ہے
[illegible] جام آتشیں [illegible]
[illegible] ہے
[illegible] خیال فلکیں [illegible]

ملا مزاج تغیر پسند کچھ ایسا — کیا قرار نہ زیرِ فلک کہیں میں نے
نکالا کعبے سے پتھر کی مورتوں کو کبھی — کبھی بتوں کو بنایا حرم نشیں میں نے
کبھی میں ذوقِ تکلم میں طور پر پہنچا — چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں میں نے
کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھکو لٹکایا — کیا فلک کو سفر چھوڑ کر زمیں میں نے
کبھی میں غارِ حرا میں چھپا رہا برسوں — دیا جہاں کو کبھی جامِ آفریں میں نے
سنایا ہند میں آکر سرودِ ربانی — پسند کی کبھی یونان کی سرزمیں میں نے
دیارِ ہند نے جس دم میری صدا نہ سُنی — بسایا خطۂ جاپان و ملکِ چیں میں نے
بنایا زردشتیوں کی ترکیب سے کبھی عالم — خلافِ معنیٔ تعلیمِ اہلِ دیں میں نے
لہو سے لال کیا سینکڑوں زمینوں کو — جہاں میں چھیڑ کے پیکارِ عقل و دیں میں نے
سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی — اسی خیال میں راتیں گذار دیں میں نے
ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں — سکھایا مسئلۂ گردشِ زمیں میں نے
کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر — لگا کے آئینۂ عقل دوربیں میں نے
کیا اسیر شعاعوں کو برقِ مضطر کو — بنا دی غیرتِ جنت یہ سرزمیں میں نے
مگر خبر نہ ملی آہ رازِ ہستی کی — کیا حزد سے جہاں کو تہِ نگیں میں نے

ہوئی جو چشمِ مغلما صرِ پرست وا آخر
تو پایا خانۂ دل میں اسے مکیں میں نے

اس عالمِ وجود میں ان گنت انسان آتے ہیں۔ اس ساری کائنات کے تین گروہ ہو جاتے ہیں۔

(۱) جو فریب جیسی حال میں زندگی کو پُر لطف بنانا پسند کرتے ہیں
(۲) جو حال میں تکلیف اٹھا کر مستقبل کو خوشگوار بنانا بہتر سمجھتے ہیں
(۳) جو حال و مستقبل دونوں کو عمدہ بنا کر زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

اسلام کے نزدیک جو لوگ حال پر قناعت کرتے ہیں آخرت یعنی ماضی میں ان کے لئے کچھ نہیں ہے اور وہ لوگ جنہیں مستقبل کی خوشگواری پسند ہے ان کا حال بھی عمدہ رہتا ہے اور تیسرے گروہ کے لئے دنیا اور آخرت دونوں زمانوں میں اللہ کا انعام ہے۔ یہی وہ گروہ ہے جو کبھی نہیں مرتا۔ موت ان کے جسم کو چھو سکتی ہے انہیں نہیں۔ اسی کا نام زندگی ہے ورنہ مر کر ختم ہو جانے کا نام زندگی نہیں ہے۔ ؎

زندگی وہ ہے کہ جو ہو نہ شناسائے اجل
کیا وہ جینا ہے کہ ہو جس میں تقاضائے اجل

انسانی قوتِ ادراک کے بل بوتے پر الا کی چھان بین کر کے خود کو فریب دیکر عارضی اطمینان حاصل کر لیتا ہے لیکن اللہ تک پہنچنے کے لئے اس کی روح بیقرار رہتی ہے۔ وہ مشاہداتِ فطرت میں اُسے حاصل کرنے کی سعی کرتا رہتا ہے۔ برسوں جنگلوں میں مارا مارا پھرتا رہتا ہے لیکن وہ شے اس کے اپنے اندر پنہاں ہے نہیں ملتی اس لئے کہ اپنی تحقیق کے لئے کوشش ہی نہیں کی اور وہ نہیں جان

سمجھتا کہ اس خاک کے نقاب میں وہ نور جلوہ افروز ہے

نور تیرا چھپ گیا زیرِ نقاب آگئی
بے غبارِ دیدۂ بینا حجاب آگئی

زندگانی جس کو کہتے ہیں فراموشی ہے یہ
خواب ہے غفلت ہے سرمستی ہے بیہوشی ہے یہ

روح کو لیکن کسی کم گشتہ منزل کی ہے ہوش
ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثلِ جرس

جس طرح سے آدمی کے مرنے سے موت و حیات کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا بعینہٖ اسلام کے نزدیک اجتماعی زندگی کا سلسلہ بھی کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ افراد کی موت سے ملت کی موت نہیں ہو سکتی۔

جو زندگی آدمی کی ہے وہ ہی
اپنے کنبے میں پیدا ہو وہی حال ہے یوں ہی

جس طرح نام زندہ ہے جسم کی موت سے روح پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ بس اتنا ہوتا ہے کہ جسم ماحول میں جو خاک ہو جاتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح ملت کی روح کو بھی زندگی ہوتی ہے اس کی زندگی اس زندگی کا حاصل کرتی ہوتی ہے۔

شاخ ملت پر ہے آسودہ نہیں ہوتا
نغمہ چہچہاتا ہے بلبل فنا نہیں ہوتا

قرآن حکیم نے مردِ مومن کی تعریف میں فرمایا ہے کہ خودی کی حفاظت کرتے کرتے خود تقدیرِ خدا بنجاتے ہیں یعنی وہ صفات جو خدا کی ذاتِ مقدسہ میں ہیں اس انسان کی فطرت میں سمو جاتی ہیں پھر وہ مخلوقِ الٰہی کے لئے باعثِ رحمت بنجاتا ہے۔ اور واقعی کئی نگاہوں سے مردہ قوموں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں

جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس انکی
الٰہی۔ کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں؟

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ انکو
یہ بیٹھا ہے پیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

نہ تستی بنگاہِ نارسا جس کے نظر سے کو
وہ رونقِ انجمن کی۔ تنہا ہی خلوت نشینوں میں

[illegible] کی تعلیم کی بنا اور [illegible] اس تصور کی [illegible] کے لئے [illegible] کے واسطے [illegible] کی [illegible] آدمی کے واسطے [illegible] ایک آدمی کے [illegible] اس [illegible] کا [illegible] کر رکھا ہے۔ [illegible] [illegible] کے [illegible] [illegible] کے [illegible] [illegible] کے [illegible] [illegible] [illegible]

یہی سعیِ پیہم نمود و ظہور کی محتاجی سے بے نیاز کرتی ہے جیسے شبنم پھول کی محتاج نہیں ہے کہ اس پر نچھاور ہوتی ہے بلکہ پھول اسکے فیض کا محتاج ہے۔ شبنم اس کے درد کی دوا بنکر خود قریب آتی ہے اس جذبے کو جذبہ صالح کہتے ہیں۔ ؎

شبنم کی طرح پھولوں پہ رہ اور چمن سے چل
اس باغ میں قیام کا سودا بھی چھوڑ دے

صلہ سے بے نیاز ہو کر دوسروں کے کام آنا ہی انسانیت ہے ؎

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بیخبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

ہماری نظر میں اس پھول کی خودی بھی زندہ نہیں ہے جو شبنم سے تازگی کی بھیک مانگتا ہے۔ ؎

جینا وہ کیا جو ہو نفسِ غیر پر مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسہ بھی چھوڑ دے

اسلام کے نزدیک تڑپ کا دوسرا نام زندگی ہے۔ اور زندگی کا اصل مفہوم کسی نصب العین کے حصول کے لئے لگاتار کوشش ہے۔ جو انسان یا کوئی جماعت بغیر کسی نصب العین کے سانس لیتی رہے وہ حیوانات سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی انسان اور حیوان میں تمیز یہی ہے کہ وہ بغیر نصب العین کے وقت گزار

لیتے ہیں اور آدمی کسی مقصد کے حصول کی خاطر وقت کو استعمال میں لاتا ہے۔ انسان کے اندر وہ قوتیں ودیعت فرما دی گئی ہیں کہ اگر وہ صحیح انداز میں انہیں حرکت دے تو اس ساری مادہ کائنات پر قدرت حاصل کر سکتا ہے۔ وہ انسان جو وقت کا مطیع ہو کر چلے اس گھوڑے سے زیادہ نہیں جسکے منہ کی لگام سوار کے ہاتھ میں ہے۔ وقت کو اپنے مطیع کرے اپنی تڑپ کو سیمابی رُوح بخشنا عین حیات ہے

چشمِ نابینا سے مخفی معنیِ انجام ہے
تھم گئی جس دم تڑپ سیمابِ سیمِ خام ہے

اسلام کے نزدیک حرارتِ جستجو سے تمیز وجود کا گرم رہنا عین حیات ہے بشرطیکہ ذوقِ جستجو صالح ہو۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب اقوام جب عروج و سطوتِ اقبال کی تلاش میں سرگرمِ عمل ہوئیں تو ان کے اندر سعیِ پیہم کی تپش پیدا ہوئی اور جب تک یہ تپش زندہ رہی تو قوم باعزت زندہ رہی اور جب وہ تپش خاموش ہوئی ساتھ ہی وقار بھی خاموش ہو گیا، وہاں پر ذلت یعنی موت نازل ہو گئی۔

شمع سحر یہ کہہ گئی تو ہے زندگی کا ساز
غمکدۂ نمود میں شعلۂ دوام اور ہے

اسلام کے نزدیک معراجِ خودی یہ ہے کہ انسان اپنی حیات کو خدا کے تابع کر دے چنانچہ زندگی کے تمام شعبے جب خدا کی رضا کے تابع ہو جائیں گے تو انسان کی فطرت خدا کی فطرت بن جائے گی۔ جس طرح فولاد آگ میں رہ کر آگ کی خاصیت اپنے اندر جذب کر لیتا ہے، وہ وہی جلا دینے کا عمل اس میں آجاتا ہے جو آگ کا فطری فعل ہوتا ہے حالانکہ فولاد کی انفرادیت بھی قائم رہتی ہے اس طرح انسان خدا کی فطرت میں جذب ہو کر اپنے اندر وہی کیفیت لے آتا ہے جو اس کی قدرت ہوتی ہے۔ کلی بھی آفتاب کی شعاعوں سے زندگی حاصل کرتی ہے اور پھول خلاء و رنگ بھی اپنا لیتی ہے۔

جب دکھاتی ہے سحر عارضِ رنگین اپنا
کھول دیتی ہے کلی سینۂ زرین اپنا

جلوہ آشام ہے یہ صبح کے میخانے میں
زندگی اس کی ہے خورشید کے پیمانے میں

سامنے مہر کے دل پیرہنِ شب رکھ دیتی ہے
کسوتِ سینۂ شبنم کو مرے لیتی ہے

چاند اگر مستقل طور پر اپنا مقام بدل کر خالی کر دے اور ایک دوسرے پر کچھ دیر قوس کی سا راہ طے کر کے ختم ہو جائے۔ مثلاً بدھ کے دن اپنا سفر شروع کرے تو ہفتے کے دن کو طلوع ہو جائے۔ یا صرف سرِ شام طلوع

ہو کر چپ جایا کرے یا رات بھر چمکتا رہا کرے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کے غیر مبتذل تصورات سے کائنات پر طبعی طور پر کس قدر برا اثر پڑتا ہے۔ دراصل یہی حرکت اور بیقراری اس کی زندگی کی روح ہے۔ ؎

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی

اس رہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے

چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

اسلام نے حکومت کی مخالفت کیوں کی تھی؟ اس لئے کہ اس نظام میں دین اور سیاست کی تقسیم ہو جاتی ہے اور یہی تقسیم ہلاکت کا موجب ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ملوکیت نے دین کو ہمیشہ سیاست کے ماتحت رکھا اور سیاست جس کا دوسرا نام سلطنت ہے سلطان کے ماتحت رہی۔ "ملوکی" نے عوام کو تحقیق سے باز رکھا اور کہا کہ ہر چیز کو بغیر تحقیق کئے مان لینے کا نام مذہب ہے۔ اور لوگوں نے مذہب اور دین کے فرق کو بھی چھپائے رکھا اور اس طرح سلطان کے دربار میں تملق پیدا ہو سکتا تھا۔ اس نظام سلطنت

اسلامیہ کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ حالانکہ مسلمان کی مشت خاک میں تو ایک صحرا پنہاں تھا اور اس ہیرے میں ہزاروں رنگ بھر دیئے گئے تھے۔ ؎

عشق کی آشفتگی نے کر دیا صحرا مجھے
مشتِ خاک ایسی نہاں زیرِ قبا رکھتا ہوں میں

ہیں ہزاروں اسکے پہلو رنگ ہر پہلو کا اور
سینے میں سیر اکوئی نرشتا ہوا رکھتا ہوں میں

دل نہیں شاعر کا ہے کیفیتوں کی رستخیز
کیا خبر تجھکو درون سینہ کیا رکھتا ہوں میں

آرزو ہر کیفیت میں اک نئے جلوے کی ہے
مضطرب ہوں دل سکون نا آشنا رکھتا ہوں میں

گو حسینِ تازہ ہے ہر لحظہ مقصودِ نظر
حسن سے مضبوط پیمانِ وفا رکھتا ہوں میں

کہتے ہیں کہ آج تک دنیا سے کوئی ایسا انسان نہیں گیا جس نے یہ کہا ہو کہ میری تمام آرزوئیں مکمل ہو گئی ہیں۔ ہر شخص تشنۂ آرزو رہتا ہے اور تشنگی کے ساتھ چلا جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ زندگی کی معیاد بہت کم تھی اور کام بہت تھے۔ لیکن اسلام کے نزدیک یہی تشنگی سعیِ پیہم کا باعث ہے۔ اور یہی سعیِ پیہم روحِ حیات ہے۔ ؎

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

اسلام کے نزدیک حیات ایک سوتے رواں ہے کہیں نہ

رکھنے والی نہیں نہ تھمنے والی مسلسل اور مستقل رواں رہنے والی اور یہ روانی اُس حالت میں قائم رہ سکتی ہے جب کہ اس کا سلسلہ قائم رہے، اور سلسلہ بھی قائم رہ سکتا ہے جب ایک نصب العین کے بعد دوسرا نصب العین پیشِ نظر رہے۔ زندگی کی موت کا وہ مقام ہے جہاں پہنچکر انسان حصولِ تمنا کا سلسلہ منقطع کر دے اور شکست خوردہ ہوکر بیٹھ جائے۔ اگر نظر کے سامنے ستاروں کی طرح انگنت منزلیں ہیں تو اسی قدر دامنِ حصول کو وسعت دینی چاہیئے۔ ؎

نہ ہو قناعت شعار گلچیں اس سے قائم ہے شانِ تیری
حضورِ گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا

نفسیات ہماری روزمرہ کی زندگی میں بمعنی فنا کے ہیں۔ انسان کے جسم سے روح کا تعلق سانس تک وابستہ ہے جبتک دم کا سلسلہ جاری و ساری رہے روح کارفرما رہتی ہے جونہی یہ دم نکلا یہ روح کی تار الگ ہوئی جسمانی زندگی کا سلسلہ منقطع ہوا۔

زندگی انساں کی اک دم کے سوا کچھ بھی نہیں
دم ہوا کی موج ہے دم کے سوا کچھ بھی نہیں

بعض کے نزدیک تکمیلِ آرزو کا نام زندگی ہے۔ وہ مسلسل کوششوں کے بعد جب اپنا مقصدِ آرزو پا جاتے ہیں تو خوش ہو کر کہتے ہیں کہ آج زندگی کا راز حاصل ہوا۔ حالانکہ اس حصول سے

نصب العین کو موت آچکی ہوتی ہے۔ گل چٹک کر سینہ بے آرزو ہو جاتا ہے لیکن شمع کی حیات مسلسل گریہ سے وابستہ رہتی ہے۔ اس لئے کہ اسکا نور زندہ ہوتا ہے۔ ؎

گل تبسم کہہ رہا تھا زندگانی کو مگر
شمع بولی۔ گریہ غم کے سوا کچھ بھی نہیں

جس وقت تک انسان اس رازِ موت و حیات سے آگاہ نہیں ہوتا یہ راز راز بنکر رہتا ہے اور جب آگاہ ہو جاتا ہے تو پھر اس راز کے پردے میں اپنے آپکو دیکھ کر مطمئن ہو جاتا ہے۔ ؎

رازِ ہستی راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو
کھل گیا جس دم تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں

وجود کو حیات عطا فرما دی گئی ہے۔ اور حیات پر اجل مسلط کر دی گئی ہے۔ لیکن وہ قومیں جو اجتماعی زندگی کے دائرے میں زندگی بسر کرتی ہیں کبھی فنا نہیں ہوتیں۔ اجل صرف اس قوم کے افراد کو چھو سکتی ہے قوم کی اجتماعی زندگی کو اسکی رسائی نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ افراد ان گسستہ تاروں کی طرح اپنی تابانیوں کو یکجا کر کے آفتاب درخشاں کی زندگی اختیار کر لیتے ہیں اور ستاروں کی موت دراصل آفتاب درخشاں کی زندگی کا سبب بنتی ہے اس سے موت نہیں کہا جا سکتا۔ موت اس قوم پر غالب آتی ہے جسکے افراد منتشر ہوں جسکا ہر فرد [illegible]

جس کا ایک پلیٹ فارم نہیں۔ یہاں جو شاہین کی طرح تمام قوتیں لھوم کر نگاہ مرکز پر رکھتے ہیں وہ اجل سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ سحر ستاروں کی موت نہیں بنتی بلکہ سحر صبح کو مئے حیات پلاتی ہے۔ ؎

ابد ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادت سحر
فنا کی آنکھ سے ہے زندگی کی مستی ہے

انسان کو دنیا میں بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اس پیام کو جو بارِ امانت عام کرے اور اپنے بھیجنے والے کا مقصود جہاں کے گوشے گوشے تک پہنچائے۔ یہ کام معمولی نہیں۔ یہ راہیں آسان نہیں ہیں ذمہ داری کا بار جو آسمانوں پر ڈالا گیا ہے۔ پاسبانی عالم کی عام ذمہ داری اس کے سپرد کر دی گئی ہے۔ اور اتنے بڑے کام کے مقابلہ میں زندگی کو اس قدر مہلت دی گئی ہے کہ انسان ؎

زندگی انسان کی ہے مانند مرغِ خوش نوا
شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا اڑ گیا
سایۂ شاخِ نشیمن کا بنا پایا کہ بار
اڑ کر اس دریا کے پایاب میں بیٹھا اک بار
نے ہمہ جولاں رود نے چشمہ نے دریا نے بحر
ہو تو سیلِ بیکراں ہے زندگی کا ہر گہر

اسلام کے نزدیک فطرت کا قتلِ عام قتل و غارتگری نہیں بلکہ تعمیر نو کے سامان ہیں۔ جس طرح شاخ سے ایک ایک پھول کو توڑ کر بظاہر ان کا قتلِ عام کر کے گلدستہ کی حیاتِ نو کے تعمیری حسن میں اضافے کئے جاتے ہیں اس طرح اگر چھوٹی شخصیتیں ایک بڑی اور اہم شخصیت کی نمود کے لئے فنا ہو جائیں قربان ہو جائیں یا بچھاور ہو جائیں تو ان کا خاتمہ قابلِ افسوس نہیں ہوتا۔ ؎

اس زیاں خانے میں کوئی ملتِ گردوں وقار
رہ نہیں سکتی ابد تک بارِ دوشِ روزگار
اس قدر قوموں کی بربادی سے خوگر جہاں
دیکھتا بے اعتنائی سے یہ منظر جہاں
ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شے کو قرار
ذوقِ جدت سے ہے ترکیبِ مزاجِ روزگار
ہے مگر اس دہر کی زینت ہمیشہ نام نو
مادر گیتی رہی آبستنِ اقوام نو

وہ قوم ہو۔ اس قوم کی ایسی حکومت جس کی قائم ہوئی ہو جس کی بنیاد سیاست کے بغیر پر کی گئی ہو ثبات حاصل نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ ... زندگی ... کا وہ دستور غیر فطری ہے۔ فطرت

وسنورِ حیات جب بھی غیر فطری دستور کا جامہ پہنکر جلوہ افروز ہوتا اسکی تابانی چراغِ سحری سے زیادہ بقائے دوام کی حامل نہ ہوگی ۔ ؎

ہے ہزاروں قافلوں سے آشنا یہ رہگذر
چشمِ کوہِ نور نے دیکھے ہیں کتنے تاجور
مصر و بابل مٹ گئے باقی نشاں تک بھی نہیں
دفترِ ہستی میں انکی داستاں تک بھی نہیں
آ دبایا مہر ایراں کو اجل کی شام نے
حکمتِ یونان و روما لوٹ لی ایام نے
آہ مسلم بھی زمانے سے یونہی رخصت ہوا
آسماں تو ابرِ آزاری اٹھا برسا گیا

فکر و عمل ایسی متاعِ حیات ہے جس کے لٹ جانے سے نہ ہوتے یا کم ہوتے ہیں زندگی میں نشاط و کیف کے لمحات فنا ہو جاتے ہیں لیکن ان لمحات کے پاؤں تلے جو ہر زندگی میں ترنم بکھیر کر جاتے ہیں نشاط و مسرت کا طالب دیکھتا ہی رہ جاتا ہے ان کی حسرت و تمنا پر دیوانہ جھومتا ہے ۔ دوسروں کے حیات افروز متاع سے غافل رہ کر درد دل کی فراوانی حاصل کر دیتی ہے ۔

گو سراپا کیفِ عشرت ہے شرابِ زندگی
اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحابِ زندگی

موجِ غم پر رقص کرتا ہے حبابِ زندگی
ہے الم کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی

آرزو کے خون سے رنگین ہے دل کی داستاں
نغمۂ انسانیت کامل نہیں غیر از فغاں

دیدۂ بینا میں داغِ غم چراغِ سینہ ہے
رُوح کو سامانِ زینت آہ کا آئینہ ہے

حادثاتِ غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال
غازہ ہے آئینۂ دل کیلئے گردِ ملال

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطفِ خواب سے
سازِ یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

طائرِ دل کے لئے غم شہپرِ پرواز ہے
راز ہے انساں کا دل ۔ غم انکشافِ راز ہے

غروبِ آفتاب پر شام کی فتح یابی کے اعزاز میں اجل تبسم ریز ہوتی ہے جیسے کسی گم راہ قوم کی تباہی پر دشمن کی قوت مذاق اڑائے ۔ بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہوتے ہیں کہ جس طرح بالیدگی اندر داخل کی پختگی کھیتی کی موت کا سبب بلکہ دانے کی حیات نو کا مقدمہ بنتی ہے اور پھر ایک دانے کی مٹی خاک میں ملکر سبز و شاداب زندگی کا جامہ پہن کر نمو و ارتقا حاصل کرتا ہے ۔ اسی طرح ایک قوم جب صراطِ مستقیم سے ہٹ کر غلط راہیں اختیار کرتی ہے تو تباہی کی جانب رواں ہو جاتی ہے لیکن یہی غلط راستے اس کی منزل سے اسے دور لے جاتے ہیں جب اسے غلط روی کا احساس پیدا

ہوتا ہے تو اس قوم میں شعور پیدا ہوتا ہے دنیائے شامِ زندگی پر سترارے کی آخری چمک سمجھتی ہے لیکن یہی شام طلوعِ سحر کے استقبال کے نئے سامان پیدا کرتی ہے ۔ ؎

عشق کے خورشید سے شامِ اجل شرمندہ ہے
عشق سوزِ زندگی ہے تا ابد پائندہ ہے

رخصتِ محبوب کا مقصد فنا ہوتا اگر
جوشِ الفت بھی دلِ عاشق سے کر جاتا سفر

عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مر جاتا نہیں
روح میں غم بن کے رہتا ہے مگر جاتا نہیں

کسان جب بالیوں سے دانے نکال کر الگ کرتا ہے تو بالیوں کو واقعی صدمہ پہنچتا ہے ۔ دانے پروردۂ آغوش ہوتے ہیں انہیں بھی غمِ جدائی بیتاب رکھتا ہے لیکن یہ دونوں حیات نو کے سررِ پنہاں سے آگاہ ہی نہیں ۔ کھنے ۔ لیکن جب دانہ خاک میں مکمل پھر بالیوں کی آغوش میں آتا ہے تو اپنی اس تجدیدِ خام پر مذاق اڑاتا ہے ۔ ؎

ہستی عالم میں ملنے کو جدا ہوئے ہیں ہم
عارضی فرقت ہے کم جان کر رو نہیں ہم

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

قوموں پر موت اس وقت مسلط ہوتی ہے جب ان کے اندر سے انکا قومی کردار ختم ہو جاتا ہے۔ قومی کردار چراغ کا تیل ہوتا ہے۔ چراغ میں جب تک تیل کا ذخیرہ رہتا ہے لو میں روشنی زندہ رہتی ہے اور اس زندگی کا دوسرا نام نور ہے۔ جس سے ظلمات کا خاتمہ ہوتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ چراغ میں تیل بھی ہوتا ہے لیکن کسی ہوا کے تیز جھونکے سے بجھ جاتا ہے اسکی روشنی ختم ہو جاتی ہے لیکن درحقیقت روحِ نور ختم نہیں ہوتی اُسے ماچس دکھایئے تو پھر منور ہو جائیگی۔ گویا بجھ کر بھی اپنے سینہ میں نور کی قوت کو بیدار رکھتا ہے۔ ؎

وادیِ ہستی میں کوئی ہمسفر تک بھی نہ ہو
جادہ دکھلانے کو جگنو کا شرر تک بھی نہ ہو

مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

علامہ اقبال نے قوموں کے ذہن میں وطن کا تصور کچھ اس طرح نقش کیا کہ یہ کبھی ہندو کے دوش بدوش ہو کر زمین — بھارت اور دیش کے ترانے گانے لگا۔ یہی وہ نغمہ تھا جس سے

تعصب پیدا ہوا اور مسلم نظریہ وطن کو مقدور محدود کرتا چلا گیا کہ خود اسلام مقید ہو کر رہ گیا۔ مغربی تمدن نے سب سے پہلے اسکی صفائی کی اور بالخصوص مسلمان کو اسکا پجاری بنایا۔ مسلمان کے پجاری بننے سے تمام غیر مسلم اقوام کی چاندی تھی۔ مسلمان وطن کی قید و اسیری میں محدود ہو گیا اور دوسری اقوام اس پر غالب آگئیں۔ ؎

یہ بت کہ تراشیدہ تہذیب نوی ہے
غارت گر کاشانہ دین نبوی ہے

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

ہو قید مقامی و زمانی ہے تباہی
رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی

ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

حضرت ابراہیمؑ کے سینۂ منور میں جب نیاز حق تعالےٰ کی آرزو پیدا ہوئی اس کی مقدس نگاہوں نے مشاہدات عالم میں تدبر فرمایا۔ انہوں نے تاریخ ہند کی زرین تابانیوں میں نور ہدایت کو دیکھنے کی کوشش فرمائی اور سمجھا کہ یہی آفتاب و ماہتاب کا ظہور اسی سرزمین سے ہوا ہے) لیکن مستقل وطن نے شاہراہ کی آغوش

تاریک میں اسے غروب کر کے آپ نے تخیل کی تردید فرما دی۔ پھر چاند کا ظہور ہوا تو انہوں نے رات کو منور کر دینے والے چاند کی قوت کو خدا سمجھا مگر اسے بھی ناپائیدار پایا۔ پھر ستاروں کی محفل میں جلوہ یار کی جستجو کارفرما رہی مگر بے ثباتی نور نے تخیل کو ایمان کی پختگی نہ دی۔ اور آخر انہیں ان سب پر قدرت رکھنے والا ملا۔ اور آپ نے ہر تگ و دو کو تبلیغ فرمائی۔ ؎

توڑ دو بندِ تمنا سے جس کو تاروں کی طناب میں
نوشتہ ہے وہ شاہینِ خوشا سے زندگی میں

ملت اسلامیہ سے جب اللہ کا انعام (حکومت) چھن گیا تو وہ بے راہ ہو کر رہ گئی۔ پھر اسکی نگاہیں بھولے ہوئے نگیں کی تابانیوں کو نورِ حقیقت سمجھنے پر مجبور ہو گئیں۔ انگریز حاکم تھا اور ملت اسلامیہ محکوم۔ اس قوم نے حاکم وقت کی تہذیب، اُسکا تمدن اور اسکی معاشرت کے سامنے سر جھکا دیا۔ پہلے اسکا طاہر پسند کیا اور اپنا لیا لیکن ستم یہ ہوا کہ یہ بے راہ قوم حاکم کا اخلاق تو لے نہ سکی اپنا اخلاق بھی کھو بیٹھی۔ نہ یہ قوم مسلمانوں کی قوم رہی نہ اسکے افراد انگریز بن سکے۔ ؎

آئینِ تو سے ڈرنا جرمِ کہن اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

یہ قوم خیالات ۔ اطوار اور تمدن کے لحاظ سے اس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی کہ سارا شیرازہ بکھر کر رہ گیا اور اس حقیقت کو زنگ الود کر کے بیٹھ گئی ۔ ؎

ہیں جذب باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

اسلام میں صالح زندگی کو انعام کہا گیا ہے اور یہی انعام تلوعت کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ اس انعام کا دوسرا نام احسان ہے جو صرف اللہ کی جانب سے کسی قوم پر ہوتا چلا آیا ہے ۔ یہ انعام و احسان حاصل کر لینے کے بعد اگر کوئی قوم اپنی بہبودی کے لئے سعی پیہم سے کام نہیں لیتی تو یقیناً وہ احسان فراموش ہے اور احسان فراموشی بلاشبہ ایک جرم ہے اور جرم کی سزا مجرم کو لازم آتی ہے اس لیے کہا گیا ہے کہ زندگی میں ملی نصب العین قائم کر کے اسکے حصول کے لئے ہر ممکن قدم اٹھانا چاہئے اور ایک لمحہ بھی غفلت میں نہیں گذارنا چاہئے ۔ کیونکہ ہمیں وقت معین کا علم نہیں ہے ۔ جب ہمارا معین وقت اپنی انتہا کو پہنچ جائے ہمیں آگاہی نہیں ہے ۔ اسلئے وقت کی رفتار کے ساتھ حصول نصب العین کی رفتار کو دوش بدوش رکھنا چاہئے ۔ جس قدر کوئی رفتار تیز سے تیز تر ہوگی دیکھنے والی آنکھ اس کا پائیدہ نہ دے سکے گی ۔ ؎

میں کہاں ہیں ہے یہ موٹر پہ منحصر
ہے جادۂ حیات میں ہر تیز پا خموش

نگاہِ بشر کے علاوہ کائنات میں ہر آنکھ مجبورِ تماشا ہے۔ ہر مناظرِ قدرت دیکھتی ہے اور دیکھ کر خموش رہ جاتی ہے۔ اسکی فطرت میں قوتِ استفسار کی روح نہیں ہے۔ لیکن انسان کی آنکھ منظرِ فطرت کو دیکھ کر خموش نہیں رہتی بلکہ محقق بنکر اس کی تحقیق میں سرگرم عمل رہتی ہے کہ یہ رنگ و بو کہاں سے اور کیوں ہیں؟

تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دنیا میں
انسان کی ہر قوت سرگرمِ تقاضا ہے

ہر شے اپنی محدود دنیا میں خوش ہے بلکہ اور سمٹ کر ماحول کو سمٹانا چاہتی ہے حتیٰ کہ سمندر کی موج ساحل سے وصال کرکے فنا ہو جاتی ہے۔ لیکن انسان موج کو دریا اور ذرے کو صحرا بنا دینا چاہتا ہے۔ ؎

اس ذرہ کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم
یہ ذرہ نہیں شاید سمٹا ہوا صحرا ہے

چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستاں کی
یہ ہستی دانا ہے۔ بینا ہے۔ توانا ہے

اسلام میں اپنی زندگی کی حفاظت کی تاکید کی گئی ہے۔ عام لوگوں کا نظریہ ہے کہ اسلام نے طبعی طور پر حفاظتِ حیات کی تاکید فرمائی ہے اور یہاں تک اجازت ہے کہ جان بچانے کیلئے سور کا گوشت بھی حلال ہے۔ مان لیا کہ یہ نظریہ بھی عین اسلامی ہے لیکن جان کو بچا کر جان کے منہوم و مقصود کی حفاظت بھی کوئی چیز ہے۔ جان و بچانے کا مقصد مقصودِ جان کی حفاظت ہے ورنہ حیوانی زندگی کی حفاظت ہمیشہ ان ضرورت نہیں رکھتی۔ مثلاً ایک مسلمان عین احکامِ الٰہی کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اور اسکے دم کے ساتھ بہت سے ملی مفاد وابستہ ہیں تو اس کی جان بڑی محترم و عزیز ہے لیکن دوسرا مسلمان صرف دنیاوی زندگی تک محدود ہے اور ذاتی اغراض کے لئے سانس لیتا ہے تو اس کا جینا اور مرنا برابر ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مقصودِ حیات کیا ہے اور اس کی حفاظت کس طرح کی جا سکتی ہے؟

مقصودِ حیات ہے نصب العین کے لئے سعی پیہم کا تسلسل اور اسکی حفاظت خودی کی حفاظت سے ہو سکتی ہے۔ ؎

لڑا لی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت وہ سیارا

اسلام نے وراثتِ ارضی سے محرومی کے اسباب واضح طور پر بتا دیئے ہیں اور کہہ دیا ہے کہ جس قوم میں فرقہ آرائی کے زہریلے جراثیم پیدا ہو جائینگے اسکی ملی ساخت کو دیمک لگ جائے گی۔ بالکل یہی حال ہماری ملت اسلامیہ کا ہوا۔ سب سے پہلے اس ایک ملت میں فرقے پیدا ہوئے پھر پھوٹ جو اس کا لازمی نتیجہ ہو سکتا ہے ظہور پذیر ہوئی۔ ہمارے مقابلہ میں دوسری قومیں یکجہتی کی وجہ سے بہت آگے نکل گئیں۔ ؎

قافلے دیکھ اور انکی برق رفتاری بھی دیکھ
رہروِ درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ
فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر
اپنی آزادی بھی دیکھ انکی گرفتاری بھی دیکھ
کافروں کی مسلم آئینی کا بھی نظارہ کر
اور اپنے مسلموں کی مسلم آزاری بھی دیکھ

بغیر خون کے باغِ ملت کی سیرابی غیر ممکن ہے۔ لیکن یہ خون انفرادی طور پر بیکار جاتا ہے اور جب یہی خون اجتماعی طور پر بہایا جائے تو بہار کی سینہ شگافی کرتا ہے۔ بغیر قربانی دیئے منزلِ

آزادی کی راہیں کشادہ نہیں ہوتیں۔ اور جب قربانیاں دیدی جاتی ہیں تو پھر غلامی کے تار و پود خود بخود ٹوٹ جاتے ہیں اور آزادی کی صبح طلوع ہوتی ہے۔ ؎

گل بلا من ہے میری شب کے لہو سے میری صبح
ہے ترے امروز سے نا آشنا فردا ترا

مومن کو اللہ تعالےٰ کی ذاتِ بابرکات نے زمین پر بحیثیت نائب بھی بھیجا تھا اور جہانبانی کی ذمہ داری اس کے سپرد کر دی گئی تھی لیکن آج یہ ساقی خود بھی نشہ مدام ہے چہ جائیکہ اسکی محفل سیراب ہو۔ ؎

سوچ تو دل میں لقب ساقی کا ہے زیبا تجھے؟
انجمن پیاسی ہے اور پیمانہ ہے پیاسا ترا

یہ ساقی نشہ اس لئے رہ گیا ہے کہ اس نے اپنے ہاتھوں سے نیت کے جام سے توحید کے خالی کر دیئے اور اب سر پر ملال ہے کہ کیا ہے۔ پھر وہی جام محبت ہاتھ آجائے۔ ؎

کعبہ پہلو میں ہے اور سوئے بتخانہ ہے
کس قدر شوریدہ سر ہے شوق بے پروا ترا

آج مسلمان پھر اس مردِ فقیر اور فردوس گم گشتہ کا متلاشی و متمنی ہے جس کا یہ وارث تھا جو اسکی ملکیت تھی جس پر اسکا حکمران تھا۔ پاتا تو ہے کہ پھر وہ تخت ارضی اللہ کا مل جائے

لیکن یہ چیز فقط چاہت سے ہی نہیں ملجاتی۔ اسکا تقاضا صالحیت ہے جبتک قوم میں مجموعی طور پر صالحیت نہیں آجاتی یہ انعام نہیں مل سکتا۔ اسکی مثال اُس چراغ کی سی ہے جس کے سینے میں تیل تو نہ ہو اور وہ نور کی تمنا رکھتا ہو۔ ؎

قیس پیدا ہوں تیری محفل میں یہ ممکن نہیں
تنگ ہے صحرا تیرا محمل ہے بے لیلیٰ تیرا

اے دُرِ تابندہ اے پروردۂ آغوشِ موج
لذتِ طوفاں سے ہے ناآشنا دریا تیرا

اُس وقت تمنا ایک حسرتِ ناکام کے سوا کچھ اہمیت نہیں رکھتی جبکہ چراغ کا تیل ختم ہو چکا ہو اور فضا کو روشنی کی ضرورت ہو۔ آج جبکہ ہماری قوم قطعی بے کردار ہو چکی ہو۔ اسے باکردار ہونیکا احساس ہوا ہے۔

آہ جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی
پھول کو بادِ بہاری کا پیام آیا تو کیا ؟

پانی میں مٹھاس کیسے آسکتی ہے جب چشمے کے سینے میں تلخی موجود ہے۔ اور دے کے دبانے سے صرف آب کی تو قع ایک فریب نہیں تو اور کیا ہے۔ ہماری ملت اسلامیہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک اسکا امیر صالح نہ ہو۔ جس زمانہ میں امیر جماعت زندگی کے نمونے پیش کرے تو قوم اسے لبیک کہتی ہے

اور اس زمانے کا امیر ہی کوئی نہیں ہے اور جسے دعویٰ ہے وہ میزان پر پورا نہیں اترتا ۔ ؎

شمع محفل ہو کے تو جب سوز سے خالی رہا
تیرے پروانے بھی اس لذت سے بیگانے رہے

یہ امیر یا جماعت یا قائد ملت شاید اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ایک دن اللہ کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا کہ ہماری عطا کردہ قوتوں سے تم نے کیا فرض انجام دیئے ۔ اور یہ پوچھا جائے گا ۔ ؎

شعلۂ الفت میں جب ان کو پرو سکتا تھا تو
پھر پریشان کیوں تیری تسبیح کے دانے ہوئے

آج ملت کی ہوئی حالت اسقدر تباہ ہو چکی ہے کہ نہ تو خود سوچنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور نہ صلاحیت کا سبق لینے کی متحمل ہے ۔ ؎

شوق بے پروا گیا ، فکر فلک پیما گیا
تیری محفل میں نہ دیوانے رہے نہ فرزانے رہے

عوام کے بنے ہوئے احساسات اور دینی تعبیر کو دیکھ کر ایک مجھ سے مبدل جماعت کا اس شب ظلمات سے نکلنے کو ترس رہی ہے ۔ حکومت پاکستان نے دستور بنانے کی طرف توجہ کی تو ہم کو امید تھی کہ لیکن اسی روحانی تشنگی

کے سامان فراہم کرنے میں ابتک کامیاب نہیں ہوئی۔ عوام اسلامی دستورِ حیات کے خواہاں ہیں، اور ملک کے گوشے گوشے سے مطالبے پیش ہو رہے ہیں کہ مملکتِ خداداد پاکستان کو حکومتِ الہیہ کی شکل میں متشکل کیا جائے اور اس سرزمین پر قانون ابدی نافذ کئے جائیں حکومت نے ایک چراغ روشن کرکے پروانوں کو جمع تو کرلیا ہے لیکن انکی زندگی کا سامان پیدا نہیں کیا کیونکہ یہ چراغ کرشمہ سازی کا شعبدہ ہے۔

وہ جگر سوزی نہیں وہ شعلہ آسا ہی نہیں
فائدہ پھر کیا جو گردِ شمع پروانے رہے؟

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

غلامی فطرتِ آزادی کو زنگ آلود کر دیتی ہے۔ لیکن وہ ہر پرندہ جو قفس میں رہ کر بھی شعورِ فطرت سے بے حس نہیں ہوتا زندگی کی نظر میں زندہ و آزاد ہے کیونکہ اسکی فکر زندہ ہے اسکی سعی و کوشش سلامت ہے اُسکے سینہ میں سوز کار فرما ہے۔ کرگس جو ایک بار پھڑپھڑا کر زخم خوردہ ہو کر خاموش ہو گیا ہے اسکی ہمت پر فکرِ آزادی نالہ کناں ہے اسکے استقلال پر سوزِ حریت ماتم کرتا ہے۔

رہزن ہمت ہوا ذوقِ تن آسانی ترا
بحر شفا صحرا میں تو گلشن میں شبنم ہو گیا

اپنی اصلیت پہ قائم تھا تو جمعیت بھی تھی
چھوڑ کر گل کو پریشاں کارواں بو ہوا

زندگی قطرے کی سلجھاتی ہے اسرارِ حیات
یہ کبھی گوہر کبھی شبنم کبھی آنسو ہوا

اُس دیدہ ور کے حسن کی آزادی کا ایک ہی علاج ہے وہ اپنے اندر پھر سے وہ نور پیدا کرے ۔ وہ نصب العین زندہ کرے جس کے قبول کا دوسرا نام آزاد زندگی ہے ۔ ؎

پھر نہیں ملتا یہ کر اسکو بڑی دولت ہے یہ
زندگی کیسی جو دل بیگانۂ پہلو ہوا

شکوہ کی اُس ملت پر جس پیار کی کمی ہے جب تک اسکا رشتہ پھول سے بلبل کو شوق سے ڈسنے ، پیوست رہے ۔ ورنہ انفرادی طور پر ایک بکھری ہوئی قوت اور وقعت نہیں رکھتی ۔ ؎

جب تک باقی تھی ملت کی جمعیت سے تھی
جب یہ جمعیت گئی دنیا میں رسوا ہو گیا

ایک قطرہ جب دریا میں شمولیت اختیار کر لیتا ہے تو پھر دریا کا ہی حصہ بن جاتا ہے اور قطرہ سے زیادہ نام نہیں پا سکتا اور ایک گرم ہوا کا جھونکا کی تندی کو کم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور جب مقابلے میں خود ہی تند ہو جائے تو دریا کو خشک نہیں کر سکتیں ۔ ؎

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں ۔ اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

مسلمان جو آج تباہ حال ہے اور اپنی اصل زندگی کو ترس رہا ہے بیچارہ ایک مریض بنکر رہ گیا ہے اور مرض کی دوا مغرب کے حکیموں سے مانگ رہا ہے حالانکہ خود ہی دوا ہے اور آپ ہی علاج ۔

آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تو رہرو بھی تو رہبر بھی تو منزل بھی تو
کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا
ناخدا تو بحر تو کشتی بھی تو ساحل بھی تو
دیکھ آکر کوچہ چاک گریباں میں کبھی
قیس تو لیلا بھی تو صحرا بھی تو محمل بھی تو
وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا
مے بھی تو مینا بھی تو ساقی بھی تو محفل بھی تو
شعلہ بنکر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوف باطل کیا کہ غارت گرِ باطل بھی تو

مسلمان یہ بھول ہی گیا کہ یہ خود ساری کائنات کا مدار ہے انسانوں کے دلوں کی دعا ہے ۔ دنیا کے درد کا علاج ہے ۔

ملت قوموں کا ماوی و ملجا ہے۔ بھولے بھٹکوں کے لئے چراغِ راہ ہے

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
سینہ ہے تیرا امیں اسکے پیامِ ناز کا
جو نظامِ دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

سب سے پہلے دنیا کے ہر فرقہ نے اپنے تخیل اور معرفت کے مطابق اپنا اپنا ایک خدا بنا رکھا تھا۔ جس سے نظامِ فطرت کی برہمی کا اندیشہ غالب تھا اور یکجہتی کا فقدان نظر آ رہا تھا۔ فطرت نے انسان کو توحید کی صداقت کے لئے پیہاں تاکہ کائنات کی تعبیر و قدرت کے قادر و مختار کی وحدت کو تسلیم کیا جائے۔ ؎

حق نے عالم اس صداقت کے لئے پیدا کیا
اور پھر اسکی حفاظت کے لئے پیدا کیا

جہاں بانی کے علاوہ جہاں داری کی دولت بھی عطا

فرمادی گئی گویا دربان کو اس گھر کا مالک بھی بنا دیا گیا ورمعراجِ عنایت سے گھر کی قسمت کے فیصلے بھی اسکے سپرد کر دیئے گئے۔

؎ قسمتِ عالم کا مسلم کوکبِ تابندہ ہے
جسکی تابانی سے افسونِ سحر شرمندہ ہے

عموماً لوگ ایک شعر کہنے والے کو ایسے زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ اسے اپنی محدود حدِ نگاہ میں مقید کر لیتے ہیں اور نفسِ شاعر سمجھ کر اس سے یوں کنارہ کش ہو جاتے ہیں جیسے ربطِ ملت سے اسکا کچھ واسطہ ہی نہ تھا حالانکہ اس زمرہ میں ایسے سخن گو بھی ہونگے جنکا ایک جملہ قوم کی ذہنیت کو جلد عوض فرما دے اس لئے دیکھنا یہ چاہیئے کہ کہا کیا ہے یہ نہیں کہ کہنے والا کون ہے

؎ شاعرِ دل نواز بھی بات اگر کہے کھری
ہوتی ہے اسکے فیض سے مزرعۂ زندگی ہری

شاعرِ ملت کا فرض اولین ہے کہ وہ ذہنی عیاشی کے سامان کو سپردِ آتش کر دے اور اپنے تخیل اور فکر کو بیہودگی سے لئے صرف کر دے اگر یہ خلیم خود پیام ہی بنجائے اور نشر و اشاعت کا ذریعہ بنجائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اسکی قوم کے دل و دماغ بدلیں۔

؎ شانِ خلیل ہوتی ہے اسکے کلام سے عیاں
کرتی ہے اسکی قوم جب اپنا شعارِ آذری

اس زمیں کو نسخۂ زندگی دوام ہے
خونِ جگر سے تربیت پاتی ہے جو سخنوری

اسلام نے مسلمان زادیوں کے لئے غیرت مقدم کر دی ہے بلکہ فطرت نے مقدم کر دی ہے۔ سب سے پہلے اسلام نے عورت کے دامن میں غیرت کے جواہرات بھرے اسی نگاہوں کو حیا کی تعلیم دی اسکے قلب میں شرم و غیرت کا چراغ روشن کیا۔ پھر اس کو جوہر کا دوسرا نام انسانیت رکھا اس مقدس عطیہ کا احترام کیا ہے۔ جب تک یہ جذبہ عورت کے رگ و پے میں موجزن رہتا ہے عورت میں عورت پن کارفرما رہتا ہے۔ جونہی یہ چمک الگ ہوئی یہ موتی بے آب ہوا۔ نظام قادر ربانیہ نے اسی جوہر کو آزمانے کے لئے تیمور کی بیٹی کو پرکھا تھا جب انکی جرأت انتقام سرد ہو گئی تو ربانیہ نے انہیں بے غیرت کہکر ذلیل کر دیا۔ اور کہا۔ ؎

یہ مقصد تھا بہ اس سے کوئی تیمور کی بیٹی
سبق فاطمہ کا مار ڈالے میرے خنجر سے
مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر
حمیت نام ہے جس کا کئی تیمور کے گھر سے

اسلام میں ارتقا کا مفہوم معراج انسانیت ہے۔ ص۔

معراج کی مختصر تفسیر یہ ہے کہ مومن شعلہ معراج الثانیت ہے۔ غیور اور شور انگیز ہے۔ مومن پر سکوت حرام ہے اور کشاکش پیہم حلال ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز — چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی
حیاتِ شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز — سرشت اسکی ہے مشکل کشی جفا طلبی
سکوتِ شام سے تا نغمہ سحر گاہی — ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی
کشاکشِ غم و گرمائے و تراش و خراش — زفاکِ تیرہ درون تا بہ شیشہ حلبی
مقام بست و شکست و فشار و سوز و کشید — میانِ قطرہ نیساں و آتشِ عنبی
اسی کشاکشِ پیہم سے زندہ ہیں اقوام — یہی ہے رازِ تب و تابِ ملتِ عربی

مسلم سلطنت کے دور میں دین اور سیاست کی تقسیم ہوئی۔ سلطان کی بقا اسی میں تھی کہ وہ عوام کو دین سے الگ کر کے سیاست سے الگ رکھے۔ سلطان بہ حیثیتِ سلطان اسی حالت میں زندہ رہ سکتا تھا کہ جب تک وہ عوام کو اسلامی حکومت و سلطنت کے مفہوم سے قطعی بے بہرہ رکھے اور یہ کوئی آسان بات نہ تھی چنانچہ اسے اہل دین (مولوی) کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ عوام کو اس انداز سے دین کی تعلیم دے کہ وہ سلطنت سے دور رہیں اس شطرنج نے مسلمان کی ذہنی بازی کو جیت لیا چنانچہ مسلمان اپنے دین سے کٹ کر ایک غریب مذہبی دنیا میں ڈال دیا گیا اس دور کے بعد جب ہم پر یہ دور آیا تو وہ اس قوم کو بے راہ پا کر خوش ہوا اور اسے آسانی

نے اسے اپنی تہذیب میں سمو لیا جس سے مسلمان کی رہی سہی شخصیت بھی ختم ہو گئی۔ لیکن مسلمان نے اس کو حیاتِ تازہ سمجھا۔ ؎

حیاتِ تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا
رقابت، خود فروشی، ناشکیبائی، ہوسناکی
فروغِ شمعِ لوئے بزمِ مسلم جگمگا اٹھی
کہ کہتی ہے پروانوں سے میری کہنہ ادراکی
تو اے پروانہ! اس کی گرمیٔ شمعِ محفل داری
چو من در آتشش خود سوز اگر سوزے داری

یہ بھی مسلمان تادم ہونے کے لئے ایک مقام پر ٹھہر گئی ہے۔ صرف ٹھہر گئی ہے رکی نہیں، اس خیال سے اسکا سلسلہ منقطع نہیں ہو جاتا کہ جب آدمی فنا ہو جائے تو یہ نیند زندگی کے سلسلہ میں نتیجہ پیدا نہیں کرتی زندگی کا سلسلہ جوئے رواں کی طرح جاری و ساری رہتا ہے۔ ؎

زندگی آلام کا انجام خاکستر نہیں
لوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں
زندگی جوہر میں دیدہ و فہم میں ہے
زورقِ نقطہ زمانہ کی سرپہ کی طوفان میں ہے
موت کا پیغام ہر نفس کے لئے نہیں
نخلِ ایمان کا ثمر ہے یہ وہ کامل نہیں

ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں

موت بیشک ایک قوت ہے جسکے اثر سے زندگی تسخیر ہو جاتی ہے لیکن فنا نہیں ہوتی جیسے بلبلے کہ ہوا کی قوت سے مٹ کر اپنی زندگی سے پھر ابھرتے ہیں۔ اگر موج میں دوبارہ بلبلے پیدا کرنیکی صلاحیت نہ ہوتی تو ہوا کی قوت کو ہم واقعی موت کہہ دیتے اور موت کا نام فنا رکھدیتے مگر ایسا نہیں ہے۔

آہ غافل موت کا راز نہاں کچھ اور ہے
نقش کی ناپائیداری سے عیاں کچھ اور ہے
جنت نظارہ ہے نقش ہوائے بالائے آب
موج مضطر توڑ کر تعمیر کرتی ہے حباب
موج کے دامن میں پھر اسکو چھپا دیتی ہے یہ
کتنی بیدردی سے نقش اپنا مٹا دیتی ہے یہ
پھر نہ کر سکتی حباب اپنا اگر پیدا ہوا
توڑ سکتی ہے اسے یوں ہمتی نہ بے پروا ہوا
اس روش کا کیا اثر ہے ہیئت تخریب پر
یہ تو حجت ہے ہوا کی قوت تعمیر پر

فطرتِ ہستی شہیدِ آرزو رہتی نہ ہو
خوب تر پیکر کی اسکو جستجو رہتی نہ ہو

بیج دبے تاریخ منوں مٹی کے نیچے دب جاتا ہے چونکہ اسکی فطرت زندہ ہوتی ہے اس لیے یہ مٹی کا دباؤ اسے دبانے میں ناکام رہتا ہے وہ زیرِ خاک آنکھ کھولتا ہے پھر خاک کا سینہ چیر کر سربلند ہوتا ہے اور زندگی کی نشو و نما حاصل کرتا ہے۔ ؎

تخمِ گل کی آنکھ زیرِ خاک بھی بیتاب ہے
کس قدر نشو و نما کے واسطے بیتاب ہے

زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہے
خود نمائی خود فزائی کے لیے مجبور ہے

سرد کی سرقندر سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں
خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں

پھول بنکر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ

ہے حدیثِ قوتِ آشفتہ کی شیرازہ بند
ڈالتی ہے گردنِ گردوں میں جو بیتاب کمند

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

ہمارا آج کا مسلمان اسبابِ زوالِ امت کے بارے میں بڑی بیباکی سے کہتا ہے کہ اگر زندگی کی راہیں صرف قرآن کریم ہی میں محفوظ ہیں تو پھر اقوامِ دیگر کیوں سربلند ہیں۔ اگر یہی ہے کہ ہمنے اللہ اور رسول ؐ کے احکامات کی پابندی سے منہ موڑ رکھا ہے تو اقوامِ دیگر نے اُس رسی کو کونسا مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے پھر وہ حاکم اور ہم جو پھر بھی مسلمان ہیں محکوم کیوں ہیں۔ یہ ایک بہت لمبی بحث ہے۔ یہاں ہم صرف اسے دو لفظوں میں ختم کر دینگے کہ ہماری ملتِ اسلامیہ نے غمِ فردا سے بے نیاز ہو کر مستقبل کے لئے کچھ نہیں سوچا اس مستقبل کا نام آخرت ہے۔ اسنے آخرت کے معاملے خدا پر چھوڑ دیئے ہیں اور انگریز قوم نے فکر سے مستقبل کو زیرِ بحث رکھا ہے۔ اس لئے اسے دنیا و آخرت دونوں پر قابو ہے ہمنے اُس قوم کی صرف ظاہری حالت کو دیکھا ہے اسکے عمل کو نہیں دیکھا۔ پھر حقیقت یہ ہے کہ اسکا یہ عروج بھی دائمی نہیں ہے اسلئے کہ فطرت کے اصولات کے تحت نہیں ہے۔

؎ اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

اسلام زندگی کے شعبوں کو استقلال ہمت ۔ عزم ۔ اور سعی پیہم کی تعلیم دیتا ہے ۔ اسکے ساتھ اسلام نے مسلمان کو علم و فن کے خزانوں کا وارث مقرر کیا ہے کہ اسرار پنہاں کی سینہ شگافی کر کے ان پر قدرت حاصل کرلی جائے ۔ قرآن میں سائنس ہے گویا سائنس قرآن کا جزو اکبر ہے ۔ تمام حقائق کے خزانوں سے معمور ہیں ۔ مسلمان کا علمی فریضہ ہے کہ علم زمین کے ساتھ علم عرش کی دولت سے بھی مالا مال ہو ۔

رہ یک گام ہے ہمت کے لئے عرش بریں
کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

ہمارا مسلمان بجائے حصول علم کی سعی کے تحقیق علم پر نکتہ چین ہے بلکہ اس تحقیق کو کفر کہا ہے جو عین ایمان تھا ۔ اور اس سائنس سائنس کو کافر کے زمرہ سے یاد کرتا ہے ۔ اور اپنی حالت پر توجہ نہیں فرماتا ۔ ؎

تجھ بیوں فکر سے کیا دل صد چاک بلبل کی
تو اپنے پیرہن کے چاک تو پہلے رفو کر لے

مسلمان سفر تن آسان ہو چکا ہے کسی دکان سے کھرا تا ہے ۔ ؎

تمنا آبرو کی ہو اگر دربار سلطانی میں
تو دو خوں میں ابھر دامن کی تر دامنی کر لے

مسلمان کو ربطِ ملت کی تعلیم دی گئی ہے جو رازِ زندگی ہے۔ وہ انسان جو ہر رہرو کے ساتھ ہے لیکن کسی کو مستقل ہمسفر نہ بنا سکے کبھی نشانِ منزل حاصل نہیں کر سکتا۔ اور وہ انسان جو پانی کی طرح اپنا مقام چھوڑ کر ہر نشیب کی طرف بہہ جائے مقامِ بشریت بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ ؎

نہیں بہ شانِ خودداری چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیبِ گلو کر لے

بلکہ اسکا جوہر حیاتِ بضد ہے کہ قطرہ کی طرح دریا میں ملکر اجتماعی زندگی سے ہم آہنگ ہو جائے۔ قطرے کی دریا سے یہی ہم آغوشی اسے دریا بنا دیتی ہے ورنہ قطرہ ہر حال میں قطرہ ہے جسکی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے اور پھر جب یہ قطرہ آغوشِ صدف میں چلا جاتا ہے تو گوہرِ آبدار کی صورت حاصل کر لیتا ہے دنیا اسے گوہرِ گراں مایہ ماننے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

اسی میں دیکھ مضمر ہے کمالِ زندگی تیرا
جو تجھکو زینتِ دامن کوئی آئینہ رو کر لے

شہنشاہ سکندر کے پاس دولت سے معمور خزانے تھے لیکن وہ دنیائے نگاہ میں عزیز نہ ہو سکا۔ اور یونان سے اس کے دورِ سلطنت کے بعد اس کے مرنے کی فراموش کر دیا۔ وہ

قنبت درویش اور تاج کیانی کو موتیوں سے جڑ دیا مگر اسکی وفات حسرت ناک کے بعد ایران نے اسکی معاشرت کو پس پشت ڈال دیا۔ چنگیز خاں نے دولت کے بل بوتے پر عوام کو ہمنوا بنانا چاہا لیکن اسکا تشدد بھی ناکام رہا۔ ہلاکو خاں نے جواہرات کے لالچ سے عقیدت کا سودا کرنا چاہا مگر اسکا استبداد خود ہلاک ہو گیا۔

قارون نے صرف دولت کے نشے میں مست ہو کر خداوندی کا عناد کیا لیکن وہ دولت موت کو لالچ نہ دے سکی۔ اسلام نے آکر قوموں کو سکھایا کہ عقیدت۔ محبت۔ الفت اور اخوت دولت سے نہیں بلکہ اخلاق حمیدہ سے حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں نے عملی طور پر ثابت کر دیا کہ ؎

یہ مری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

تاریخ آدم شاہد ہے کہ جنگ کوئی اسیر مستقل طور پر اسیری میں نہیں رہا۔ بلکہ تاریخ نے دنیا کا وہ سرانجام انقلاب رکھا ہے۔ قوموں میں یہ انقلاب کیوں آتے ہیں؟ محکوم قوم جب کسی حکومت کی اسیری قبول کرتی ہے تو اسکے سب پر تبسم نہیں ہوتا بلکہ اسکے سرقوں دم توڑ جاتا ہے۔ اسیر ہونے سے پہلے اسیری کے وجوہات پر تاخیر سے غور ہوتی ہے جب آپ اسکی غلامی کی زنجیر بنجاتی ہے لیکن

غلامی میں آزادی اور زندگی کے احساس کو حرارت دیکر گرماتی ہے۔ جسقدر وہ اسیری میں بندش محسوس کرتی ہے اُسی قدر جوہرِ حیات میں آبداری آجاتی ہے۔ ؎

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشکِ اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے
مشک بنتی ہے جو کر نافۂ آہو میں بند

جس قدر فطرتِ انسانی فنا جی۔ اسیری اور غلامی میں بیتاب و بیقرار ہوگی اُسی قدر اپنی آزادی اور اہوں کی کشادگی کے لئے ہمہ تن مصروف رہیگی اور جب وہ اپنی کوششوں سے زندگی حاصل کریگی تو اسے ایک گونہ لطف و مسرت محسوس ہوگی۔ ؎

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

دوسرے انسان کو سہارا دیکر فکرِ زندگی سے بے نیاز کر دینا سب سے بڑی دشمنی ہے۔ بظاہر انسان سہارا دینے والے کو بہت بڑا کریم سمجھتا ہے اور تادمِ آخر اسکے احسانات کے گن گاتا رہتا ہے۔ لیکن وہ نہیں سمجھتا کہ محسن کا یہ احسان یا سہارا اسکی فطری قوتوں کو کچلیاں دیکر سلا رہا ہے۔ اسکی بیباک چنگاریوں پر اوس گرا رہا ہے۔ اُسکے پلتے ہوئے ولولوں کو افیون پلا رہا ہے۔ اور اس کا یہ

حسن کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اسکے مقابلہ میں جو کسی کو سہارا نہیں دیتا دیکھا جائے تو دائرہ انسانیت میں سب سے بڑا حسن ہے جو اسکی بیدار قوتوں کو نکما نہیں بناتا۔ اسکی نشوونما کی راہ میں پتھر نہیں بنتا۔ اُس کے ذہنی ارتقا میں رکاوٹیں پیدا نہیں کرتا بلکہ اسے ایک فاقہ دیکر اسکی غیرت پر ضرب کاری لگاتا ہے۔ ذلت کی پستیوں سے اٹھا کر انسانیت کی راہوں پر لاکر کھڑا کر دیتا ہے۔ وہ اس صحرا میں پہنچکر وسعت حیات کو محسوس کرتا ہے اور زندگی کی ہزاروں راہیں اُس کا استقبال کرتی ہیں۔ ؎

کیوں تعجب ہے میری صحرا نوردی پر تجھے
یہ تگاپوئے دمادم زندگی کی ہے دلیل
پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

حصول غایت العین تک بڑی کٹھن منزلیں آتی ہیں لیکن ثابت قدمی و استقلال اُسے منزل پر لے ہی رہتے ہیں۔ ؎

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی — ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ — جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے — سرّ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی
زندگی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ — جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی
زندگی میں ہمت فرہاد سے کم تر نہ ہو — اور آزادی میں عمر جاویداں ہے زندگی

آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی
خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

"بندے کا خدا ہو جانا" یہ وہ فقرہ تھا جس پر کفر کے فتوے عائد ہوتے رہے اور دار و رسن کے بارہا قصے ہمیشہ تازہ ہوتے رہے۔ ہمارے مولوی نے یا تو قرآن کریم کو سمجھا نہ تھا اور اگر سمجھا تھا تو عوام کو اسلئے نہ سمجھایا کہ مبادا عوام اسکے ہاتھ سے نکل جائیں۔ اللہ کی تفسیر اللہ کا قانون ہے یعنی قانونِ خداوندی کا ہی دوسرا نام خدا ہے چنانچہ جو سوسائٹی ان قوانین خداوندی کی علمبردار ہوگی وہ بعینہٖ طرح کی خدا بنجائیگی جیسا کہ خدا نے فرمایا ہے کہ ہمارے ساتھ تعاون کرو۔ یہی وہ تڑپ تھی جس نے اس خاک میں جان ڈالی ہے۔

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے
خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب تا بدخشاں کے پھر وہی لعلِ گراں پیدا کرے
ڈالدو اس نالۂ شبگیر کا نیچے سفیر رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرے

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصہ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] دماغی توازن پر غالب آ جاتے اور جب دماغی توازن [illegible]
[illegible] اس فکاہت سے سب شے بھول جاتے ہیں۔ حکومت [illegible]
[illegible] کے لئے [illegible] حکومت
[illegible] میں تبدیلی نہیں پیدا [illegible] میرا وقت کو [illegible]
[illegible] سے فرار کیا ہے۔ بلکہ ان دونوں چیزوں سے منتظر ہے۔ حکومت
[illegible] حرف الشر کے [illegible] منصور [illegible] ہے اور قوانین حکومت [illegible]
[illegible] قانون [illegible] حدود رہتے ہیں [illegible] حکومت
[illegible] کی [illegible] کی [illegible] مداخلت نہیں کر [illegible]۔ لیکن جو ہی [illegible]
[illegible] دستور کے ماتحت [illegible] اور [illegible] کی تمام [illegible]
[illegible] ہے [illegible] جام ہاتھ سے گر کر [illegible] ہو جاتے ہیں۔
[illegible] وقت اسکی آواز [illegible] ہو [illegible]۔

[illegible] کی [illegible]
[illegible] کی [illegible]
[illegible] چشم وا کر دست [illegible] در نگر
[illegible] وقت [illegible] کی [illegible]
[illegible] اس [illegible]
ایک [illegible] کی [illegible]
[illegible] سال [illegible] [illegible]

[illegible] حکومت کی [illegible] [illegible]

[illegible] نے حکومت کو اللہ کے سپرد کر دیا۔ اسلام نے باہمی مشورت کو
[illegible] کر دیا۔ اور کہیں سے۔ عام حکومت کے معاملات کو مجلس
[illegible] کر دیا۔ اور [illegible] وقت حکومت پذیر ہو سکتی ہے
جب عام مملکت اپنے [illegible] نہ ہو بلکہ اس مشورت سے مشترکہ
[illegible] ہو۔ یہ منزلہ [illegible] آزاد ملک کی نمائندہ جماعت [illegible]
[illegible] اپنے [illegible] کے [illegible] جو دینے کے [illegible]
[illegible] کی [illegible] کی [illegible]
[illegible] جن [illegible] کی [illegible]
[illegible] کی [illegible] جاتا ہے۔

[illegible] کے [illegible] پر [illegible] ہوگی
[illegible] کا [illegible] ہوگا۔

[illegible]

بھی نہیں ہو سکتا۔ جب تک کوئی شخص اپنی زندگی کی وجوہات کو
جتنے طور پر جائزہ لیکر ایک نتیجہ پر نہیں پہنچتا وہ اپنی راہوں کا رخ نہیں
بدل سکتا یہی حال امت اسلامیہ کا ہے اسے یہ معلوم نہیں کہ بوفکی
نسان اپنے خدا کی زبان بھول گیا تھا۔ اسے اپنی معرفت کی۔ ہم بھی
یہ نہیں ہیں بیستار سے جبکہ دراہ تھے۔ حالانکہ قرآن پکار پکار کر
کہہ رہا ہے کہ۔

خدا نے فطرت کا دست قدرت تو زباں تو ہے
یہ زباں بیدا کر اے غافل کہ مطلوب جہاں تو ہے

یہ سے تیرا نیل فامے منزل مسلماں کی
ستارے جسکی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے

زبیجیم ہے پیغام تو پیغام زندگی ہے
مسلماں ہے حدیث سوز و ساز زندگی ہے

آج ہم اپنی نظر اپنی بچوں کی تیرہ دلی نے تو ان سے دوسروں کی
پیغام سنا اور سنا رہے ہیں۔ آج ہمارے جہاں ہے تو ہم اپنی تقدیر
کے خود ذمہ دار ہیں کی ذمہ داری لے رہا ہے۔ ہم
اسے بھی ہم ہی ہیں ہم ہی ہیں ہم ہی ہیں۔

[illegible] لالہ سے خون جگر [illegible]
[illegible] سے [illegible] جاں [illegible]
[illegible] ابن [illegible] کائنات زندگانی کی
[illegible] کے [illegible] کا [illegible]
[illegible] دل کی [illegible] کی خاطر
[illegible] ساتھ [illegible] کی [illegible]
[illegible] کا [illegible] کا
[illegible] کی [illegible] دنیا کی [illegible]

[illegible] جن سے [illegible]
[illegible] کی [illegible] و [illegible]
سا نور سرکشی پیدا ہوتا ہے۔

[illegible]
[illegible] کی [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی
جب اس انگارہ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

تقسیم ہند یعنی وجود پاکستان سے پہلے ہندوستان میں اس
وقت ایک ہی جماعت برسر عروج تھی اور وہ کانگریس جماعت
کی روح انقلابی دور کے سنہرے خواب و بیتاب بادلوں کی بیخودی
جلوس بادہ تنہا چلے منتظر ہو سنورے ۱۸۵۷ء سے انگریزی دور
حکومت کی خاتمہ شروع ہوئی۔ حکومت سے اپنی مقدس دی
ہوئی اشیاء کو جبر کے ساتھ چھین کر قبضہ کر رکھا تھا مگر
اسکے برعکس مسلم لیگ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت پیٹ فارم
پر آئی اور بغیر کسی تشدد و ہنگامے کے اپنی منزل معینہ کی طرف دیوانہ
وار بڑھتی چلی گئی۔ اس عزم راسخ کے دوش میں یقین۔ اس کے
یقین میں مستحکم ارادوں میں ایسی منفرد قوتیں کارفرما
تھیں اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی منزل تک پہنچ گئی دنیا انگشت
بدنداں رہ گئی لیکن کسی نے کہا۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

ولایت ۔ بادشاہی ۔ علم اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

[illegible] تجربہ سے [illegible] کیا [illegible]
[illegible] کی تشریح [illegible] کرتے [illegible]
[illegible] عظمت [illegible] قوم کو [illegible] پہلے

[illegible]

خفا ہیں شان سے جھٹکے جو اپنے بال و پر شاہیں
شکارِ شام کے خوں رنگ میں ڈوب کر سحر کر لے

[illegible] شکست سے متاثر ہوتے ہیں لیکن ہمت نہیں ہارتے جب تک وہ اس شکست کو فتح مندی میں تبدیل نہیں کر لیتے چین سے نہیں بیٹھتے۔ وہ کشمکشِ حیات سے برسرِ پیکار رہتے ہیں۔

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے ادھر نکلے ادھر ڈوبے ادھر نکلے

[illegible] دستانِ عظمت دیرینہ کی [illegible] کی [illegible] کی ترجمانی کرتے ہیں۔

افیس افراد کا سرمایہ تعمیر ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے

قرآن حکیم نے مومن کو خدا کی ترجمانی کی تعلیم دی ہے۔ اقبال نے اس نکتے کو بیان کر دیا ہے کہ وہ اپنی دلیل کا نمونہ بن گئے ہیں۔

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
خرد کو غلامی سے نجات دے کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر دے
ملا زادہ ضیغم سے نسلِ افغاں
نہ شاہیں بچے نہ شاہیں بنے
کہ شاہیں بناتا ہے مرغِ مسلماں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور
نگہ اونچی رکھ اور سوچ اور کر
غریبی میں نام آور بسر کر
جو کرتا ہے ہر کام بے طمع اللہ کے واسطے
اسی کے لئے حکمت ہے خیر اور شر

ت اسلامیہ اپنے دستور حیات کو ترک کر کے دنیا کے

سامنے کچھ اس انداز سے نادم ہے کہ گویا نبی دین اسلام کا نام لینا بھی گوارا نہیں ہے، اور اپنے تئیں مسلمان کہتے ہوئے جھجکتی ہے۔ بیشتر اس کے کہ دیگر اقوام عالم اسکا مذاق اڑائیں یہ خود ندامت سے سر بگریباں ہو جاتی ہے۔ یہ اس قوم کا حال ہے جو اقوام عالم کو سربلندی و سرفرازی کے طریق سکھانے آئی تھی۔ آج اس کی پشیمانی پر اہل خوش فکر یہ کہتے ہیں۔

تو جو بدلی تو یہ چشمک زناں کہکشاں
سب تجھا نہ میرے دل سے شناسا ہوں کر
آشتی کی خاک کے ہر ذرہ سے تعمیر حرم
دل ہے بیگانہ انداز کلیسائی کر
اس گلستاں میں بہت حسن گذرنا اچھا
زندگی کر تو باندازِ رعونائی کر

پیام اقبال

[illegible]

جو کچھ زمین اور آسمانوں کے اندر ہے ۔ جو کچھ ان پستیوں اور بلندیوں میں ہے سب کچھ تمہارے تابع فرمان کر رکھا ہے ۔

یہ تو اس کائنات سے متعلق ہے ۔ لیکن قرآن کریم تو اس سے بھی آگے جاتا ہے ۔ اسکا ذکر آگے چل کر آئے گا ۔ حضرت علامہ اس بات کی گزری ہوئی کہاوتوں کی تحقیق میں زیادہ کاوش پسند نہیں فرماتے کہ وہ ایک نظری شے ہے ۔ ہماری "آج" کی دنیا پر اسکا کچھ زیادہ اثر نہیں پڑتا اس لئے وہ فرماتے ہیں کہ

خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے ؟
قرآن کریم کوئی علم حیات ہے ۔ اس کی چیز نہیں کہ اس

میں ان امور کی رہبری دے رکھی ہو باقی ہم جہاں کہیں بھی کائنات انسانی ذکر میں آگیا ہے جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ وہی ہے ۔ بسیرا ان اپنے کمال تحقیق کے بعد پہنچے گا ۔ یہی حالت دیگر علوم سائنس کے متعلق ہے قرآن میں تقریباً وضاحتاً جہاں جہاں اشارہ آگیا ہے وہ ایک حقیقت ثابتہ ہے جو نہیں سکتا کہ انسانی مکتشفات جس نتیجہ پر پہنچیں ۔ قرآن اسکے خلاف ہو بشرطیکہ وہ انکشاف حقیقت کی حد تک پہنچ چکا ہو ۔ محض قیاس آرائی ہی نہ ہو انسانی انکشاف ہے کہ ابھی ایک حقیقت پردہ پڑا ہوا تھا ۔ وہ نظروں سے اوجھل تھی ۔ انسانی کوشش نے اس پردہ کو اٹھا دیا ۔ وہ حقیقت جس کی طرف قرآن نے کوئی اشارہ کیا ہے ۔ اشارہ فضا میں موجود تھا ۔ بلکہ کی لہریں ہمیں تڑپ رہی ہیں

[illegible] سے [illegible] نہیں۔ اب سب نقاب ہو کر سامنے آگئیں
[illegible] نے ان تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے اگر یہ چھپی ہوئی ہیں
[illegible] کی نگاہوں سے چھپی ہوتی ہیں۔ خدا کی
نگاہوں سے تو چھپی ہوئی نہیں ہوتیں۔ اس لئے جہاں کہیں [illegible]
[illegible]۔ وہ تو ایسے ہی کرتے ہیں جیسے کوئی اس چیز کی بابت کہے جو
ان آنکھوں کے سامنے بے نقاب موجود ہو۔ پھر کس طرح ممکن ہے کہ
[illegible] اختلاف کے نتائج اور قرآن کریم کا بیان باہمی متضاد ہوں۔
[illegible] نہیں متضاد ہو۔ سمجھ لیجئے کہ [illegible] کی تحقیق میں ابھی غلطی ہے۔ ایسے وہ
[illegible] رہا ہے۔ قیاس آرائی ہے کہ جب حقیقت۔ حقیقت ہو کر
[illegible] آنے کی تو وہ وہی ہو جو اس حقیقت کے پیدا کرنے والے
[illegible] کتاب میں بیان فرمائی ہے۔ اس نظریہ [illegible] کو لیجئے جو دور حاضرہ
[illegible] ہیں [illegible] آرہا [illegible] جانا چاہئے۔ اس نظریہ [illegible]
[illegible] بطور حقیقت کے معلوم ہوتی ہیں وہ وہی ہیں جنکا ذکر قرآن
کریم میں موجود ہے [illegible] روشنی میں اسلامی مفکرین۔ مثلاً فارابی۔
[illegible] ولیس [illegible] سے کہیں پہلے ان نظریوں کی
[illegible] کی تھی۔ نظریہ ارتقاء اور قرآن کریم میں جو اشارات ہیں۔

[illegible] اپنی آنکھوں سے [illegible]
[illegible] نظریہ [illegible] قرآن کریم [illegible]
[illegible]

جسے کہیں اور بیان کیا جائے گا) لیکن یورپ کے حکما اس نظریہ کے ماتحت
انسان کی سابقہ کڑیوں کی تحقیقات کے بعد مطمئن ہو جاتے ہیں اور انسان
کو اس سلسلہ کی آخری کڑی سمجھتے ہیں۔ کہ اس کی موت کے ساتھ یہ سلسلہ
ارتقا بھی منقطع ہو جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم اس حصہ زندگی کو محض ابتدا
قرار دیتا ہے وہ کہتا ہے منزل تو ابھی شروع ہوئی ہے انسان کی موت
اس سلسلہ ارتقاء کا خاتمہ نہیں بلکہ ایک اگلی کڑی کی ابتدا ہے۔ آپ دیکھیے
کہ سلسلۂ ارتقاء میں جمادات سے نباتات اور نباتات سے حیوانات تک
تدریجی ایک نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ اگلی منزل میں بقا پچھلی
منزل کی ایک نئی کیفیت پائی جاتی ہے جو مجرد مادہ میں موجود نہ تھی۔
مادہ غیر شعوری شے ہے، اس میں عقل و ادراک نہیں۔ لیکن مٹی سے
درخت اور درخت سے حیوان کی تدریجی ترقی میں یہ کیفیت نظر آئے گی
زندہ چیز جو مادہ میں مفقود تھی۔ ان کی اگلی کڑیوں میں پیدا ہوتی جاتی
ہے۔ حیوانات میں ایک حیثیت کی زندگی۔ عقل و شعور آ جاتا ہے
اور اس سے اگلی منزل۔ یعنی انسان میں یہ حضور بن کر ایک نئی
چیز شعور کی

سامنے آتا ہے۔ ہر چند یہ "غیر مادی" عنصر ہے ایسا ہی کہنا چاہیئے کیونکہ
کوئی لفظ اس مفہوم کو ادا نہیں کر سکتا۔ انسان میں آ کر نمایاں ہو گیا
ہے۔ لیکن بایں ہمہ یہ عنصر ابھی اپنے ارتقا میں ہے۔ لہٰذا یہ
نہیں ہو سکتا کہ یہ سلسلہ یہیں ختم ہو جائے۔ اس کا آگے بڑھنا ضروری ہے
وہیں آگے بڑھنے کی منزلیں ہیں جہاں جا کر یورپ کے حکماء اور ایک
مسلم حکیم میں فرق شروع ہوتا ہے۔ حکیم مومن کے نزدیک حیات ایک
مسلسل شے ہے۔ موت اس کا خاتمہ نہیں کر دیتی، بلکہ شب تیرہ و تار
کے بعد ایک نیا دن طلوع کرتی ہے۔ مادی عنصر میں تو تاریکی ہی تاریکی
ہے۔ یہ عقل و خرد، یہ تصور و ادراک کی چمک تو مادہ سے آگے بڑھنے
کی کوشش ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ مسلسل ارتقا جو آگے بڑھنے کا تیر
و نشتر کی طرح تیز ہوتی جائے گی۔ وہ لوگ جن کی منزلیں
[illegible] یعنی جیسے [illegible] میں یہ صلاحیت پیدا کر دیں
کہ وہ موت کی زندگی سے لطیف و لطیف تر سطح پر واقع
زندگی بسر کر سکیں۔ وہ اعلیٰ منزلوں میں جا کر ختم ہو جائیں
گے۔ [illegible] نہیں [illegible]

[illegible] ارتقا کی اعلیٰ منزلیں [illegible] نہیں پہنچ سکیں گے۔ وہ [illegible]
[illegible] کی زندگی ہوگی۔ لہٰذا وہ زندگی کو
[illegible] کی زندگی ہے۔ [illegible]
[illegible] انسان کا مستقبل [illegible] وہ [illegible]

جو حضرت علامہ کے تمام کلام کا گویا لبِ لباب ہے۔

یکے در معنیٔ آدم نگر از من چہ می پرسی — ہنوز اندر طبیعت می تپد ذوقِ تجدد ہا
بہ ہر اندازِ خود ایں پیش پا افتادہ مضمونے — کہ بیروں دل از تاثیرِ او بیرونِ خود ہا

اس کلام کی بلاغت میں شان کا درجہ کس قدر بلند ہے اسکے لئے اس داستانِ حقیقت کشا کو دیکھئے جو تخلیقِ آدم کے باب میں ہمیشہ ادا ہی تمثیلاً بیان کی گئی ہے اور جس میں فطرتِ انسانی سے خطاب ہے۔ حضرت آدم گویا تمام نوعِ انسانی کے جد ہیں فرشتوں سے کہا جاتا ہے انی جاعل فی الارض خلیفہ۔ میں دنیا میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں کی معصوم نگاہیں جب اس پتلے کو غور سے دیکھتی ہیں تو اس میں خون کے چھینٹے اور آگ کی چنگاریاں نظر آتی ہیں۔ عرض کرتے ہیں کہ بار الٰہا یہ نقشہ ساری چیزوں کی مجموعہ و شیعۃ فی الارض ہے اور دنیا کے تمام فتنوں کا ہم کو نظر آتا ہے۔ لیکن تمام تجربات و تقلبات کے بعد بھی وہ تمام اور اپنے اختیار و ارادہ کے بغیر وہی کچھ کرتا ہے جس کا حکم دیا جاتا ہے۔ خود اطاعت سے [illegible] انسانی کی اور [illegible] فی الارض [illegible] ہوں۔ [illegible] ہے اور [illegible] کی [illegible] حکم [illegible]

[illegible] کلام بھی اس سے بہت کچھ جانتے ہو۔ [illegible]
[illegible] لا علم لنا الا ما علمتنا۔ ہم تو اتنا ہی جانتے
ہیں جتنا تم نے سکھایا ہے۔ [illegible] فرمایا کہ [illegible] تمہارے رازوں کا [illegible]
[illegible] اس قابل [illegible] یا [illegible] تمہارے سامنے جھک جاؤ [illegible]
[illegible] حقیقت کا پردہ کھل گیا، وہ جھک اور [illegible]
حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ

[illegible]
[illegible]

بال جبریل میں فرماتے ہیں ؎

[illegible]
[illegible]

[illegible] کی [illegible] کی [illegible]
[illegible] کہ [illegible] انسان کی [illegible]
[illegible] انسان کی [illegible] کی [illegible]
[illegible] انسان کی [illegible] پانی [illegible] نوازنا
[illegible] کوئی انسان باقی نہ رہے تو بھی سلسلہ
[illegible] میں کوئی نقص واقع نہ ہو۔
[illegible] انسان کا وجود اس نظام کا [illegible]
[illegible] عزت نہیں کہ [illegible] دنیا [illegible]

کی خاطر ہے یہ دنیا کی خاطر نہیں۔ یہ اس سے کسی بلند و بالا تر مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے، وہی چیز اسے نظامِ کائنات سے ممتاز کرتی ہے۔ لیکن یہ شرف اجتبار۔ یہ امتیاز و خصوصیت محض ایک انسان کے گھر میں پیدا ہو جانے سے ہی نہیں حاصل ہو جاتی ہے ایک "یقین کامل" اور "عمل پیہم" کی ضرورت ہے۔ جب کسی قوم میں یہ باتیں پیدا ہو جاتی ہیں تو وہ "خیر امت" بنجاتی ہے اس کو حزب اللہ اللہ والوں کی جماعت کہتے ہیں۔ اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔ کہ اس جماعت۔ اس حزب اللہ کا مقام کس درجہ بلند ہو گا اس جماعت کے بھولے ہوئے فرد سے خطاب کر کے فرماتے ہیں:-

اپنی صلبیت سے جو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ کر تقدیر تسخیر عناصر کی ہے تو
ہو نہ کشور جس سے وہ تسخیر سے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ سامان بھی ہے

قرآن اور خود کی

دعائے خلیل

اقبال (در قرآن)

"اور (یاد کرو وہ وقت) جب ابراہیم اور اسماعیل (عظیم الشان انقلاب انگیز وقت تھا) جب بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔ اور اسماعیل بھی اس کے شریک تھے۔ ان سے ہاتھ تو پتھر چننے میں مصروف تھے اور دل اور زبان یہ دعا میں تھی کہ

اے پروردگار! ہم تیرے دو عاجز بندے تیرے مقدس نام پر اس گھر کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ تاکہ یہ دنیا میں تیری توحید کا مظہر اور وحدت انسانیت کا مرکز بن سکے۔ تو ہم سے اس عمل کو شرف قبولیت عطا فرما۔ بلاشبہ تو ہی سب کی دعاؤں کا سننے والا اور دلوں کے ارادوں کا جاننے والا ہے۔ اے پروردگار ہمیں ایسی توفیق عطا فرما کہ ہم اپنے مسلم ایمانی پر قائم رہیں۔ تیرے شکر گزار بندے بنیں اور ہماری نسل میں سے بھی ایک گروہ [illegible] تیرے [illegible] کا

[illegible] اور اس کے سوتی اور [illegible] کو [illegible] سکھا دے۔ بلاشبہ تو ہی بڑا رحم کرنے والا ہے۔ اس محمدیت کی امامت سے صحیح انداز و طریق [illegible] اس باب میں ہم سے اگر کوئی بھول یا فروگذاشت ہو جائے تو تو ہمیں اس کی قوتوں سے درگذر فرما دے کہ

بلاشبہ تیری ہی ذات ہے جو رحمت سے درگذر کرنے والی ہے"

"اور خدایا ایسا کیجیو کہ اس بستی کے بسنے والوں میں تیرا ایک رسول مبعوث ہو جو انہی میں سے ہو۔ وہ تیرے احکام سے لوگوں کو آگاہ کرے۔ کتاب اور حکمت کی تعلیم دے۔ ان کے جوہرِ انسانیت کو بالیدگی عطا کرے۔ یقیناً تو غالب حکمت والا ہے۔ ۲/۱۲۷۵-۱۲۷۹

حضرت ابراہیمؑ نے یہ دعا اپنی آنے والی نسلوں کے لئے مانگی۔ اس دعا میں دنیاوی حکومت۔ رزق اور جاہ و جلال کی کہیں آرزو نہیں ہے۔ حالانکہ قرآن ہی کے فیصلہ ہیں کہ بغیر قوت کے کوئی قانون نافذ نہیں ہو سکتا۔ آپ حیران ہوں گے کہ پھر اس قوت و غلبہ کی تمنا کیوں نہیں کی گئی۔ جواب نہایت آسان ہے۔ دعا معراجِ انسانیت اور شرفِ انسانیت کی مانگی گئی ہے۔ شرفِ انسانیت ایک ودیعہ ہے جس کے اندر دین و دنیا کی تمام قوتیں موجود ہیں اور یہ تمام قوتیں اپنے حقائق سے خود ہی بہتر آگاہ ہیں۔ خود کی نام سے اپنی اور اپنے جوہر کی حفاظت کا جوہر انسان کو عطا ہوا ہے۔ اور اس جوہر کا مکمل اظہار شعب میں انسانوں کی نام معنی یہ ہے کہ اور تمام حضرت علامہ اقبال نے اسی معرفت کی عظمت کی تشریح فرمائی ہے۔ رموزِ بیخودی میں ارشاد ہے کہ:-

خودی چیست؟ دریافتِ ملتِ ما است
رازِ ملتِ ما ز سرِ ما است

خودی ہے زندہ تو دریا ہے بیکرانہ ترا !!!
ترے فراق میں مضطرب موجِ نیل و فرات
خودی ہے مردہ تو مانندِ کاہِ پیشِ نسیم !!
خودی ہے زندہ تو سلطانِ ہمہ موجودات
نہ وہ بجلی ہے اگر محروم !!
دو صد ہزار تجلی تلافیِ مافات !!
مقامِ بندۂ مومن کا ہے درست بہر
زمیں سے تا بہ ثریا تمام لات و منات
حریمِ ذات ہے اس کا نشیمنِ ابدی
نہ تیرہ خاکِ لحد ہے نہ جلوہ گاہِ صفات

آرزوئے کریم

"رحیم ہستی نے اپنے رب سے دعا مانگی کہ خدایا اس زندگی میں بھی
اور آخرت کی زندگی میں بھی ہمارے ساتھ
بھلائی کر، دوزخ کی آگ سے بچا۔"

"اللہ نے فرمایا میرے عذاب کو تو میں جس کو چاہوں دیتا ہوں
اور میری رحمت ہر چیز پر حاوی ہے۔"

رحمت۔ سو وہ ہر شے پر چھائی ہوئی ہے۔ اس میں اس رحمت کو ان لوگوں کے لئے مقدر کر دوں گا جو برائیوں سے بچیں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے اور جو میرے قوانین پر ایمان لائیں گے ——— جو رسول کی پیروی کریں گے کہ نبی امی ہوگا اور اس کے ظہور کی خبر اپنے یہاں توراۃ اور انجیل میں لکھی پائیں گے۔ وہ انہیں معروف کا حکم دے گا۔ منکر سے روکے گا۔ طیبات حلال کرے گا خبائث حرام قرار دے گا۔ اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس کے نیچے وہ دبے ہوئے ہوں گے۔ اور ان پھندوں سے وہ نکالے گا جن میں وہ گرفتار ہوں گے۔ سو جو لوگ اس پر ایمان لائیں گے اور تمام مخالفانہ قوتوں کی روک تھام کریں گے اور (تمکین دین کے لیے) اس کی مدد کریں گے اور اس روشنی کی پیروی کریں گے جو اس کے ساتھ بھیجی جائیں گی۔ سو وہی لوگ کامیاب پانے والے ہوں گے۔" ۷/۱۵۶ - ۱۵۷

حضرت موسیٰ کو جو خدا کی جانب سے جواب ملا وہ صاف اور کھلا ہوا بیان ہے کہ رسول یک روشنی لے کر تشریف فرما ہوں گے چنانچہ جو لوگ اس روشنی کو دیکھنے کی آنکھ رکھیں گے وہ اس پر ایمان لائیں گے یعنی نور رسول اللہ کو تسلیم کریں گے سو نجات انہی کے لئے ہے۔ لیکن جو لوگ سب باتیں اور وہ

سے فکر و تدبر کی تنگ دامانی پر تنقید کریں گے وہ کبھی فلاح نہیں پا سکتے جہاں تک
تجلی کی فراوانی موجود ہوتی۔

خرد کی تنگ دامانی سے فریاد
تجلی کی فراوانی سے فریاد
گوارا ہے اسے نظارۂ غیر
نگہ کی ناتوانی سے فریاد

آب و ہوا

تاریخ کی بے دامنیوں پر شاہد ہے کہ چودہ سو سال پیشتر دنیا کا یہ نقشہ
تھا کہ ہر زندگی کی ہر شاخ سے نمی خشک ہو چکی تھی۔ تہذیب و تمدن کے
پھول وحشت و بربریت کی باد سموم سے مرجھا چکے تھے جس جگہ کے زندگی
بخش چشمے خشک ہو چکے تھے۔ زمین پر جو ہر انسانیت کی سرسبزی و شادابی کا نشان
تھا باقی نہ رہا تھا۔ [illegible] صدیوں سے بنی تھیں۔ کھیتیاں اجڑ چکی تھیں۔
[illegible] زمین پر انسان کو زندگی کا سامان [illegible] کا سرچشمہ نہیں ملتا تھا۔ زمین
[illegible] آسمان کی جانب تک رہے تھے۔ جیسے کچھ [illegible] کا [illegible]
[illegible] خزاں کو چہرہ شگفتگی پر بدل دیا [illegible] وجہ
[illegible] حضرت محمد کو بھیجا [illegible] انسانیت کی [illegible]

کھیتیاں لہلہا اٹھیں۔ ہم وہی تھے جن کے ابرِ کرم نے خزاں کے دامن کو پھولوں سے بھر دیا اور آج بھی وہی ہم ہیں کہ اپنی نگاہ سے اپنا راستہ بھی نہیں دیکھ سکتے۔

کہن ہنگامہ ہائے آرزو سرد
کہ ہے مردِ مسلماں کا لہو سرد
بتوں کو میری لادینی مبارک
کہ ہے آج آتشِ اللہ ھو سرد

شکست بتکدہ

مردِ مومن شمشیر بکف ہوا۔ توحید کا دریا۔ دنیا کے صنم کدوں کے بت پاش پاش ہو گئے۔ شیطین نے پہاڑوں میں جا کر منہ چھپا لیا۔ جور و استبداد کی ہر طاغوتی قوت روپوش ہونے لگی۔ دنیا سے باطل کی تاریکیاں دور ہوئیں کہ نورِ آفتابِ عالمتاب کا طلوع ہوا جس کے کیف دار نے اس جگمگاتے ہوئے کہہ کر پکارا۔ دورِ انسانیت نے انقلاب و تسلسل کو ایک کر دیا۔ احبار و رہبان کی برہمنیت کے اطواق و سلاسل نیست و نابود ہو گئے۔ توہم پرستی کی بھیانک سوزنیاں ختم ہو گئیں۔ انسان ایک بار پھر زمین پر سر اٹھا کر چلنے لگا۔ عقل کو تشنگی کا جنون ہوا۔ فکر کو تشنگی ہوئی۔ بادشاہی کا

[illegible] نے قلندری غنیمت جانا۔ [illegible] خود تقدیرِ یزداں بن گیا۔ اور اس مردِ مومن نے دوسروں کو یہ کہہ کر جھنجھوڑ کر۔

تیرے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں!!
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟

حریمِ شباب

[illegible] حالت شباب کا وقت آیا۔ صحیفۂ فطرت حریمِ شباب میں آگئی وادیٔ [illegible] کے [illegible] پر بارش ہوئی۔ ہر وقت سرتوں کے چشمے ابلنے لگے۔ چاند سکڑ [illegible] نظر آنے لگے۔ آسمان سے نور کی بارش ہوئی۔ فلک [illegible] نظر آنے لگے [illegible] پہلی [illegible] کی [illegible] کی [illegible] وقت [illegible] کی کلیوں [illegible] عجیب [illegible] اسلام کا [illegible] توحید کا [illegible] [illegible] آسمان پر [illegible] بلند ہونے [illegible] [illegible] حضرت [illegible] کے گھر کو [illegible] [illegible] [illegible] عجیب [illegible]

دیا کہ :-

خرد دیکھے اگر دل کی نگاہ سے
جہاں روشن ہے نورِ لا الٰہ سے!
فقط اک گردشِ شام و سحر ہے!
اگر دیکھیں فروغِ مہر و ماہ سے

رحمۃ للعالمین

یہ آپ ہی رحمۃ للعالمین بن کر آیا۔ اور اپنے ساتھ ایک نظامِ عدل لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ اسی محمدؐ کی وساطت سے کتابِ مبین کی تعلیم عام ہوئی۔ یہ روشنی جس مقام میں بنی تھی وہ ایک تندیلِ سامان کی کوئی نہ کوئی کرن تھی۔ جو قلبِ محمدیؐ میں اتاری گئی۔ یہ گلدستہ جو خراب کعبہ میں رکھا گیا اس کے پھولوں میں بنی دبی ہوئی وحدت تھی۔ جس کے سوا دوسرے کی اطاعت حرام ہے۔ آپ سے پہلے بن فدیہ بنی نوع آدم نے انہوں نے ایک نئی تعلیم عام کر دی اور ظلمت کا چہرہ جس دہاں کی بجھے ہوئے دیوں کا حسین جھونکا ہے۔ وہ ہشیار تھے یہ بھول گئے۔ وہ زندگی سے پریشان تھے۔ وہ قدرت سے بے بہرہ تھے۔ وہ اپنے ہی پیدا کردہ تھے۔ اس لئے پھر وہ بھولا ہوا سبق یاد دلایا اور انسان کو اس کے جوہر

ست روشنی کرتے ہوئے فرمایا کہ :

کبھی دریا سے مثلِ موج ابھر کر
کبھی دریا کے سینے میں اتر کر
کبھی دریا کے ساحل سے گذر کر
مقام اپنی خودی کا فاش تر کر

اسرارِ آدمیت

نہ تو ذاتی تنہائیوں میں تصوف کی مصنوعی زندگی ایک انفرادی تجربہ گاہ
کی زندگی تھی۔ لیکن جب حقیقت نے آپ پر کھلا اپنا انکشاف کیا تو
آپ نے مقصود یہ نہیں تھا کہ آپ اس آئینہ دستی سے عالم میں جذب ہو کر
غائب کر دینے کی زندگی اور فنا ادبیر شیخی کا طریق اختیار کر لیتے۔ زندگی
دوسرے دیگر جیسے بدلے تھے باتے سے آپ کو خود آگہی و خود شناسی
کی منزل تک پہنچا دیتی۔ سب سے پہلے اس خیالی زندگی پر نظر کی جو
مدتوں سے انسان خود ہی بگڑتی ہوئی سوسائٹی کے ہاتھ آپ نے
تمام قوموں کو یہ سبق دیا کہ :-

گر ہو جاتا سب جہاں محکوم قوموں کا ہو
فقر تھا سے جہاں پیدا سو در رنگ بو

پاک ہوتا ہے ظن و تخمیں سے انسان کا ضمیر
کرتا ہے ہر راہ کو روشن چراغِ آرزو
وہ پرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں
عشق سیتا ہے انہیں بے سوزن و تارِ رفو
ضربتِ پیہم سے ہو جاتا ہے آخر پاش پاش
حاکمیت کا بتِ سنگیں دل و آئینہ رو

اللہ تعالیٰ نے مومن کے متعلق فرمایا کہ :-

"یہ وہی جنت ہے جسکا تمہیں ان اعمال صالح کی وجہ سے وارث قرار دیا گیا ہے" ۵ (۴۳/۷۲)

آج دنیا بھی ہے اور دنیا میں مسلمان بھی ہیں اس کے باوجود ملوکیت اور سرمایہ داری نے انسانوں کی گردنوں میں اپنی چیرہ دستیوں کے طوق پہنا رکھے ہیں۔ کفر و باطل نے انسان اور خدا کے درمیان دیواریں حائل کر رکھی ہیں۔ نظام عدم و ظلم برتر ہو چکا ہے نوعِ انسان وحدتِ خلق کا بنیادی سبق بھلا کر رنگ، نسل، وطن اور زبان کی غیر فطری سرحدوں سے ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی ہے۔ یہ سب اس لئے ہے کہ مسلمان اپنے مقامات کو کمزوریوں سے اپنی بلندی سے گر چکا ہے ورنہ

. . . . . .

زندوں کو بھی معلوم نہیں صوفی کے کمالات
ہر چند کہ مشہور ہیں ان کے کرامات

خود گیر و خود دار و دلیر و نگہ و تاطق !!
آزاد ہو سالک تو ہیں یہ اس کے مقامات

محکوم ہو سالک تو ہیں اس کا ہمہ اوست
خود مردہ و خود نقد و خود مرگ و مفاجات

شہنشاہی

حضرت ابراہیم کو دشمن نے کہا اگر اپنی روش سے باز نہ آؤ گے تو
قتل کئے جاؤ گے۔ یا زندہ جلا دیئے جاؤ گے

ابراہیم کی فرمائش اس نے سوا کوئی جواب نہیں تھا کہ وہ کہنے
لگے۔ یہ میں نہیں آتے ہو مجھے قتل کرو یا آگ میں جلا دو
چنانچہ دشمنوں نے ابراہیم کو بیچ آگ میں جھونک دیا مگر خدا نے
اسے آگ سے بچا لیا۔ آگ اسے کوئی گزند نہ پہنچا سکی۔ بادشاہ
نے قصہ سنا رعیتوں کے لئے جو خدا کی حفاظت پر ایمان رکھتے
ہیں بڑی فتح ہے۔ بادشاہ نے کہا ۔ $\frac{۱۰۹}{۲۱۲}$
اس ایک مثال سے آپ نے دیکھ لیا کہ ایک مومن کا خدا پر ایمان

سے کوئی قوت کوئی جبر اور کوئی استبداد روک نہیں سکتا۔ وہ موت، کیفیت اور گزند کے خوف سے کسی غار میں نہیں چلے گئے تھے۔ خانقاہ کے حجرہ میں بند نہیں ہو گئے تھے۔ رہبانیت اختیار نہیں کر لی تھی۔ کسی صوفی قوت سے دب کر نہیں رہ گئے تھے۔ حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ ان کی کوئی پارٹی نہیں ہے کوئی جماعت نہیں ہے۔ کوئی اکثریت نہیں ہے اور یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ وہ اس وقت یک محکوم کی حیثیت سے تھے۔ قانون ان کا نہیں تھا حکومت ان کی نہیں تھی۔ زمین ان کی نہیں تھی۔ سلطنت ان کی نہیں تھی۔ وہ خود حاکم و سلطان نہیں تھے۔ اس کے باوجود وہ باطل کے سامنے جھکے نہیں۔ اور آج یہ عالم ہے کہ حکومت اپنی ہے۔ قانون اپنا ہے زمین اپنی ہے۔ ملک اپنا ہے۔ اور آج مورخہ ۲۲ ۱۲/۵۰ کو روزنامہ جنگ میں اعلان ہوتا ہے کہ گاندھی کا بت کسی وجہ سے اکھڑ کر گر گیا ہے حکومت کو اس کا افسوس ہے۔ حکومت اس کی تعمیر میں فکرمند ہے۔ اور بہت جلد دوبارہ اس بت کو اسلامی حکومت کی آزاد فضا میں نصب کر دیا جائیگا۔ دوسری طرف اقبالؒ کا یہ اعلان ہے کہ:۔

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبّیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
نہ ہے دین و ادب سے آری بوئے رہبانی
یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالمِ پیری

شیاطینِ ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جلوہ
کہ خود خچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری

بے نیاز

جب فرعون کو معلوم ہوا کہ میرے خوف سے ڈر کر کچھ لوگ موسیٰ پر ایمان لے آئے ہیں تو فرعون نے ایک روز انہیں، سب جادوگروں کے دربار میں بلایا اور کہا۔

"تم بغیر میرے حکم کے موسیٰ پر ایمان لے آئے؟ ضرور یہ تمہارا سردار ہے جس نے تمہیں یہ جادو سکھایا ہے۔ اچھا۔ دیکھو میں کیا کرتا ہوں۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں الٹے سیدھے کٹوا دوں گا۔ اور کھجور کے تنوں پر سولی دوں گا۔ پھر تمہیں پتہ چلے گا کہ ہم دونوں میں کون سخت عذاب دینے والا ہے۔ اور کس کا عذاب دیرپا ہے۔"[۲۱]

اس سے پہلے ان کے دلوں نے آئینۂ کفر و باطل کے گرد و غبار سے ڈھک رکھے تھے، اور اس قدر موٹی تہہ جم گئی تھی کہ آئینے کے جوہر چھپ کر رہ گئے تھے۔ اس سے انہیں خود کوئی خبر نہیں آ رہی تھی۔ لیکن جب ایمان کے ابرِ رحمت نے ان کو دھو دھلا کر شفاف کر دیا تو وہ چمک گئے اور خود ہی وہ جو رسمان نظر آنے لگا۔ فرعون کی غضبناک باتیں سن کر وہ کانپ نہیں گئے تھے بلکہ مضحکہ اڑا رہے

تھے۔ اور اپنی ایمانی قوتوں کے سامنے اس کی طاغوتی قوتوں کو خس و خاشاک سے زیادہ نہیں سمجھ رہے تھے۔ ان کی خاموش زبانیں کہہ رہی تھیں کہ ہمارے ہاتھ پاؤں کٹ جانے سے دل کے رشتے نہیں کٹ سکتے۔ ظلم کرو تاکہ ستم کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک جائے۔ اب اُن کی آنکھوں کے سامنے آفاق کی سرنگوں ہے۔

کھلا جب چمن میں کتب خانۂ گل
نہ کام آیا ملا کو علم کتابی
متانت شکن تھی ہوائے بہاراں
غزلخواں ہوا پیرِ کہسار رابی!
کہا لالۂ آتشیں پیرہن نے
کہ اسرارِ جاں کی ہوں میں بے حجابی
سمجھتا ہے جو موت خوابِ لحد کو
نہاں اس کی تعبیر میں ہے خرابی
نہیں زندگی سلسلۂ روز و شب کا
نہیں زندگی مستی و نیم خوابی!!!

چہروں پر بنی دلوں کے اندر چھپ کر فرعون کی فرعونیت تلمسا اٹھی جو دستِ
لی رگوں میں خون دوڑ گیا۔ اس نے اس سے بھی زیادہ ظلم و تشدد کا پرچار

رہا تھا۔ لیکن خدا کے مختصر سے لشکر نے جواب دیا کہ تب ہم محکوم و غلام تھے ہماری رگیں ریشم سے زیادہ نرم تھیں انہیں جھک جانے میں کوئی تکلیف محسوس نہ ہوتی تھی۔ اور انہیں جھکانے کے لئے کسی آتش و حرارت کی بھی ضرورت نہ تھی لیکن اب وہ رگیں چٹان کے پتھروں کی طرح سخت ہو گئی ہیں جن پر تمہارے تیشے بھی کند ہو جائیں گے۔ اور پھر انہوں نے قلندرانہ ارادوں سے طاغوتی قوتوں کو پیغام دیا کہ :-

آزادی کی رگ سخت ہے مانندِ رگِ سنگ
محکوم کی رگ نرم ہے مانندِ رگِ تاک
محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید
آزاد کا دل زندہ و پرسوز و طرب ناک
آزاد کی دولت دلِ روشن نفسِ گرم
محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک !!
محکوم ہے بیگانہ خطر عمل و مقدر
ہر چند کہ دانا کی دلیلوں میں ہے چالاک
ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہمدوش
دو جسم ہیں اک جان یہ خواب افلاک

یہ ہے آزادی کی بہادرانہ جو حضرت موسیٰ کے ساتھ کی خود توجیہہ

کی علمبردار ہو گئی۔ ٹھیک اس وقت فرعون کی طرف سے انہیں بہکانے کے لئے ایک منظم سازش شروع ہوئی۔ فرعون نے کچھ آدمی ایسے پیدا کئے جو بظاہر حضرت موسیٰ کے حلقے میں جا ملے اور اندرونی طور پر یہاں دین کو بہکانا شروع کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر کچھ ایسے لوگ جن کا محکم نہیں تھا کہ فرعون سے جانے کے بعد جلد ہی حقیقت سے آگاہ ہو کر توبہ کے درد زدہ پچھتانے لگے۔ اور پکار پکار کر کہنے لگے۔

ناصر خارش و نامی خودی سے بیگانہ
اولیٰ بتائے یہ مسجد ہے یا کہ بت خانہ

یہ راز ہم سے چھپایا ہے میرے مولا نے
کہ خود حرم سے پلائے فرعون کا پیمانہ

طلسم جبری کافری و دیں داری
حدیث شیخ و برہمن فسوں و افسانہ

نصیب خطۂ یارب دہندۂ درد و تیز
کہ جس کے فقر بھی اندیشہ ہوں حکیمانہ

[illegible]
[illegible]

. . . . . .

اسلام کیا ہے

[illegible]

قرآن کریم نے حضرت ابراہیمؑ کی تعریف میں فرمایا کہ :-

"اور اس شخص سے بہتر دین رکھنے والا کون آسکتا ہے
جس نے اللہ کے آگے سر نیاز جھکا دیا اور وہ نیک عمل بھی کرے
اور ساتھ ہی ابراہیمؑ کی پیروی بھی کی جو صرف خدا ہی کے
لئے ہو رہا تھا اور اللہ نے ابراہیمؑ کو اپنا دوست
بنا لیا تھا جس سے کچھ بھی اندازہ نہیں کر سکتے ۔" ۱۲۵

اس سے ثابت ہوا کہ دوست شناس جانے "مسلم" ہونے کا اس
[illegible] ابراہیمؑ کو اپنا دوست بنا لیا تھا جیسے
[illegible] کون جان سکتا ہے ؟

آپ [illegible] قرآن شریف [illegible]
[illegible]

جب ان تمام باتوں کے مطابق [illegible] قوم
[illegible] کیا [illegible] ؟

درحقیقت وہ قوم خدا کی ایک [illegible] بن گئی [illegible]
[illegible] ایک [illegible] کی [illegible]

ہوتی ہیں۔ یہ قوم طلوعِ آفتاب کے ساتھ کسی مقام پر ہوتی ہے تو غروبِ آفتاب کے وقت کسی دوسرے مقام پر ہوتی ہے۔

نشاں یہی ہیں زمانے میں زندہ قوموں کے
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں!
کمالِ صدق و مروّت ہے زندگی ان کی!
معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں
قلندرانہ ادائیں سکندرانہ جلال!!
یہ امتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں!!!
خودی سے مردِ خود آگاہ کا جمال و جلال
کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں

جب یہ امت فکرِ خدا کی حفاظت میں شمشیر بکف اور کفن بردوش میدان میں نکلتی ہے تو ان کی ہیبت اور ان کے ارادوں کے استقلال سے آسمان بھی تھرا اٹھتا ہے۔

دلیروں جہاں ان کے زورِ عمل سے
بڑے معرکے زندہ قوموں نے مارے
نجم کی تقویم فرد سے باطل!
کرے آسماں سے پرے نئے ستارے

ضمیرِ جہاں اس قدر آتشیں ہے
کہ دریا کی موجوں سے ٹوٹے ستارے

زمیں تنگ نہیں ہے

حضرت ابراہیمؑ جب آگ سے محفوظ رہے تو اُس قوم نے اسے جادو کا نرالہ اور ایمان نہ لائے کیونکہ فسادِ قلبی بے حد شدید ہو چکی تھی۔ اب حضرت ابراہیمؑ نے اس زمینِ شور کو چھوڑ کر فلسطین کی طرف ہجرت فرمائی۔ جب آپ کے والد نے دھمکی دی کہ اگر تم ہمارے بتوں کی مذمت سے باز نہ آؤ گے تو میں تمہیں سنگسار کر دونگا تو آپ نے فرمایا کہ:۔

"میں نے تم سب کو چھوڑا اور انہیں بھی جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو۔ میں صرف اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں۔ امید ہے کہ اپنے پروردگار کو پکارنے میں محروم ثابت نہیں ہونگا۔ پھر جب ابراہیمؑ ان لوگوں سے اور ان سب سے جن کی اللہ کے سوا پوجا کرتے تھے الگ ہو گئے۔ تو ہم نے اس کی نسل میں برکت دی اور اسے اسحاق اور اسحاق کا بیٹا یعقوب عطا فرمایا۔ ان میں سے ہر ایک کو ہم نے نبوت دی تھی۔ اور اپنی بخشش کی رحمت سے سرفراز کیا تھا۔ نیز ان سب کے لئے سچائی کی مسند میں بلند کر دیں۔ اور جو کچھ

خاموش ہو نے دلی زمیں ؟ ۔ ۵ ۱۴/۵۵ - ۴۸

انہی لوگوں، ورنہ ایسے ہی بیان دلوں کے لئے علامہ نے فرمایا ہے کہ

ع غلام قدسیوں کے علم و عرفاں کی ہے یہی رمز آشکارا!
زمیں اگر تنگ ہے تو کیا ہے فضائے گردوں ہے بے کنار!

داستانِ یوسفؑ

حضرت یوسفؑ نے اپنے باپ حضرت یعقوبؑ سے اپنا خواب بیان فرمایا کہ :-

"اے میرے باپ میں نے خواب میں دیکھا کہ گیارہ ستارے ہیں اور سورج اور چاند - اور یہ دیکھا کہ یہ سب مجھے سجدہ کر رہے ہیں ۔ ۱۲/۴

بیٹے کا یہ خواب سنکر باپ کی خوشیوں کی انتہا نہ رہی ۔ باپ کو علم تھا کہ اس سے پہلے بھی اللہ تعالےٰ نے نبوت کی دولت سے اس خاندان کو نوازا ہے ۔ اس لئے باپ نے محبوب بیٹے کو سینے سے لگایا اور فرمایا ۔

"باپ نے کہا ۔ اے میرے بیٹے ، اپنے اس خواب کا حال اپنے بھائیوں سے نہ کہنا ورنہ وہ تیرے خلاف کسی منصوبے کی تدبیر کرنے لگیں گے ۔ ۵ (۱۲/۵)

اور یہ تنگ باپ نے فرزند کی عظمتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے خوابیدہ بیٹے کو نصیحت دی کہ ۔

نہیں مقام کی خوگر طبیعت آزاد
ہوائے سیر مقامِ ستارہ پیدا کر

جزیرہ چشتِ تیرے سنگِ سارہ دیکھ لے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

بس جانوں کہ یوسف ایک روز اُن سب سے فضیلت حاصل کرنے والا ہے۔ اس کی تیز ذہنی ۔ وہ برداشت نہ کر سکے کہ اُن کا باپ اُن پر ناخوش ہو۔ یہ ناقابلِ برداشت بات تھی ۔ انہوں نے ایک منظم سازش کی ۔

"اور جب ایسا ہو تو یوسف کے سوتیلے بھائی آپس میں ملے ۔ اور کہنے لگے ۔ جب سے باپ کو یوسف اور اس کے بھائی زیادہ پیارے ہیں ۔ حالانکہ ہم سب ایک زور آور جماعت ہیں ۔

اور یقیناً ہمارا باپ صریح غلطی پر ہے ۔ 12/8-9

"یوسف کو مار ڈالیں یا کسی ایسی جگہ پھینک آئیں کہ ہمارے باپ کی توجہ ہماری طرف ہو جائے اور اس کے بعد ہم بھلے لوگ بن جائیں ۔"

جب یہ سازش طے پا گئی۔ تو سب مل کر باپ کے حضور میں پہنچے۔

"تب سب مل کر باپ کے پاس آئے اور انہوں نے کہا۔ اے

ہمارے باپ کیوں آپ یوسف کے بارے میں ہمارا اعتبار نہیں

کرتے ہو اور ہمارے ساتھ کہیں جانے نہیں دیتے! حالانکہ ہم

سب اس کے دل سے خیر خواہ ہیں کل ہمارے ساتھ اُسے جنگل

میں جانے دیں کہ کھیلے کودے اور کھائے پیئے۔ ہم اس کی

حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔" (۱۲/۱۰-۱۲)

باپ کا دل دھڑک گیا اور بیٹوں کے ارادوں پر ایک نظر ڈالی اور دل

میں کہا کہ:۔

زمانہ اپنے حوادث چھپا نہیں سکتا

تیرا حجاب ہے قلب و نظر کی ناپاکی

باپ نے انہیں صاف صاف تو نہ کہا اور اسطرح کہا کہ:۔

"یہ بات مجھے غم میں ڈالتی ہے کہ تم اُسے اپنے ہمراہ لے جاؤ اور

میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے بھیڑیا کھا جائے۔" (۱۲/۱۳)

باپ نے خوف کی کہ ایسا ممکن ہے کہ ہمارے موجودگی میں کوئی جنگلی

درندہ یوسف پر حملہ آور ہو جائے۔ پھر یہ تو نکمے ہوتے ہیں اس کے بعد جب ان

یوسف کو اپنے ساتھ لے گئے اور خفیہ تدبیر کے مطابق کرنے کے لئے کنوئیں

نہ دیا۔ یوسف نے تاریک کنویں میں گھبرائے اور سوچا کہ اس زندگی سے موت بہتر ہے۔ دل نے جواب دیا۔

تیری نجات غمِ مرگ سے نہیں ممکن
کہ تو خودی کو سمجھتا ہے پیکرِ خاکی

اذانِ بلالؓ

میدانِ جنگ میں کثر ایسا ہوا کہ مقابل کی دو صفوں میں ایک طرف رسول اللہ اور آپ کی جماعت اور دوسری طرف اپنی کے عزیز و اقارب برادر۔ ہم وطن۔ ہم رنگ و ہم نسل ہوتے۔ اپنی لوگوں کو خدا نے پرائے کہا ہے۔ خدا کے نزدیک یہ بھی ہے۔ حضرت بلالؓ حبش کے رہنے والے تھے۔ نہ ہم وطن۔ نہ ہم نسل۔ نہ ہم رنگ تھے۔ لیکن اپنے آپ سے ہو گئے کہ ہم وطن ہو گئے۔ یہاں کی آدمی کو شرفِ آدمیت کے بلند مقاموں تک پہنچاتا ہے۔ یہی ایمان ہے جو انسانیت سے ہمکنار و ہم آغوش کرتا ہے ان سے یہ ایمان فکر و یہاں مستحکم کر دیتا تھا کہ جب آپ اذان کہتے پہاڑوں پر سناٹا چھا جاتا تھا۔ اسلام نے ان حقیقتوں کی بنا پر شعر فرمایا ہے کہ:۔

یہ سرِ جو کبھی نمرود ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتا ہے بال سے پیدا

نہیں ہم یوسفؑ

جب حضرت یوسفؑ قافلہ والوں کے ہاتھ آئے تو انہوں نے مفت پاکر کوئی قدر نہ پہچانی۔ اور مصر کے بازار میں جاکر گنتی کے چند درہم پر نیلام کر دیا۔ اس غلام پر فطرت پر داں سر دھنتی رہی تھی۔ یہ غلام، دراصل بے قدری سے بکا ہوا غلام اس انداز سے مصر میں داخل ہوا۔ ان سے یا نہوں نے مصر میں فوطیفار سے خریدا جو فرعون کا ایک امیر لشکر تھا جیسا۔ یہ آدمی مصر میں ایک عالی افسری حیثیت رکھتا تھا۔ قرآن نے اسے عزیز کے لقب سے یاد کیا ہے (بڑی عزت والا)

لیکن تھوڑے ہی دنوں میں آپ کی راست بازی، دیانت داری، حسن سیرت اور خداداد فراست سے اس قدر نیک نام ہو گئے کہ یہی آقا (عزیز) آپ کو عزت کے ساتھ رکھنے پر مجبور ہو گیا۔ اور چند ہی روز میں ایک بہت بڑے صاحب منصب میرے گھر بار کے حاکم بن گئے۔ ان حرم حضرت یوسفؑ کے قدموں میں جھاد پڑے گئے۔ اور بہت بڑے خوبصورت کو ان کے حوالے کر دیا گیا۔ اور معاملہ فہمی کے ساتھ پہنچا دیئے گئے۔

ع گر گرد غنچہ کی کھلتی نہیں سب ہوتے نسیم!

ان دونوں کے بعد کا روان شوق اس وادی میں داخل ہو جہاں ہوش کی آزمائش کے لئے ترغیبات نفس کے صحرا کے دامن اگا دفتر جب من طرح ہوتا ہے

[illegible] ہم ہمرنگ زمین کی [illegible] بھرے اور بچے ہوئے ہوتے ہیں
[illegible] اگر ہر وقت بھرپور جوانی کی تھی۔ لیکن اس جوانی کی
[illegible] کی آغوش تربیت جوانی تھی۔ قلب و نگاہ کی پاکیزگی چمک دمک فطرت
[illegible] پرورش میں ملی تھی۔

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے گہر
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے

[illegible] چیزیں اللہ تعالیٰ کو دنیا کی امانت کے کام لینے ہوں [illegible]
[illegible] چیزوں سے نکل کر کندن بنتی ہے۔

[illegible] اسلام کی ہے نور خودی نار خودی
زندگی کے لئے نار خودی نور حضور

یہی ہر چیز کی تقویم یہی اصل نمود
گرچہ اس روح کو فطرت نے کیا ہے مستور

[illegible] زندگی جوئی آب پہ [illegible] اور [illegible] یوسف کو [illegible]
[illegible] یوسف پر اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ یوسف نے اپنے رب کی
[illegible] تو عورت کی بدلی نگاہ [illegible]
[illegible] یوسف کو گرفتار دکھ [illegible] اور
[illegible] وقت خود [illegible] عورت نے مکر و فریب سے

کام لیا۔ اور اپنا سارا جرم اس بے گناہ کے ذمہ لگا دیا۔ لیکن حضرت یوسف کا ضمیر مطمئن تھا کیونکہ آپ بے گناہ، اور بے قصور تھے اور آپ نے اعلانیہ کہا کہ اس عورت کے ارادوں میں کھوٹ تھا۔ اور مجھے کمرے میں لے گئی۔ میں اس گناہ سے بھاگا۔ تو یہ مجھ پر لپکی۔ میں بالکل بے گناہ ہوں۔ عزیز کو لامحالہ بیوی کی طرف داری منظور تھی۔ بات قبیلے میں پھیل گئی۔ آخر کار عورت کے قبیلے میں سے ایک شخص نے کہا کہ اگر کرتا آگے سے پھٹا ہے تو لڑکے کی دست درازی ثابت ہے اور اگر کرتہ پیچھے سے پھٹا ہوا ہے تو لڑکا بے گناہ ہے۔ عورت کی دست درازی اس سے ظاہر ہے۔

عجب نہیں کہ بدلدے اسے نگاہ تیری
بلا رہی ہے تجھے ممکنات کی دنیا!

اس گواہی سے عورت کا جرم ثابت ہو گیا۔ اس پر عزیز کو کچھ غیرت نہ آئی۔ اور نہ ہی عورت کی پیشانی پر شرم و حیا کے قطرے نمودار ہوئے۔ زیادہ سے زیادہ یوسف سے صرف اس قدر کہا گیا کہ دیکھ صاحب زادے یہ بات اس سے زیادہ باہر نہ جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ غیرت انسانی نفس سے پیدا ہوتی ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب تہذیب کی بنیاد ایمان باللہ کی بنیادوں پر استوار ہو۔ جہاں ایمان نہ ہوگا وہاں غیرت نہ ہوگی، اور غیرت ہوتی ہے آزاد قوموں میں۔

کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو
کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی

عورت اس کے بعد کبھی باز نہ آئی اور ایک روز حضرت یوسفؑ کو بلا کر کہنے لگی میں تمہیں قید خانے میں بند کر دوں گی اور نہ میری خواہش کو پورا کرنے کا عہد کرو۔ پھر ایک نئی آزمائش شروع ہوئی۔ یوسف نے کہا۔ خدا سے ڈرو اس کا غضب بہت بڑا ہے۔ عورت نے کہا۔ مجھے کیا معلوم خدا کہاں ہے اور کیسا ہے میرا خدا میرے گھر میں (بت) ہے اور وہ میرے قبضے میں ہے۔ حضرت یوسفؑ نے پھر سمجھایا کہ میرا خدا آسمان پر ہے ہر شے پر قدرت رکھتا ہے ہر شے کے نزدیک ہے اور وہ سب کچھ سنتا ہے اور دیکھتا ہے وہ رحم کرنے والا بھی ہے اور غضب دینے والا بھی۔ عورت نے کہا میں تیرے خدا کے وجود کو نہیں دیکھتی مجھ سے میری بحث نہ کر۔ یوسف نے کہا

تیری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
میری نگاہ میں ثابت نہیں وجود تیرا
وجود کیا ہے فقط جوہرِ خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود تیرا

عورت سے کہہ دو۔ ایک طرف تمہاری آرام زندگی ہے۔ ہر ایک پر قدرت عزت و وقار دوست و حشمت۔ اور دوسری طرف قید اور اس کی

مصیبت۔ اب تمہیں اختیار ہے جو چاہے پسند کر لو۔ حضرت یوسفؑ نے آسمان کی طرف دیکھا اور بے اختیار کہہ دیا کہ مجھے جیل اور اس کی مصیبت پسند ہے۔ یہ سنکر عورت نے طعن سے کہا۔ تمہارے پاس کوئی قوت ہے کہ تم اپنے خدا کا پرچار کر سکو۔ دیکھو میرے پاس قوت ہے اور جسم پتھر کٹ ہو میری قوت کے خوف سے دنیا اس کے سامنے جھکی رہتی ہے۔ اور یوسفؑ سے کہا۔

دوست کی حفاظت نہیں بے قوت بازو
آتی نہیں کچھ کام یہاں عقل خداداد
مستِ مردِ خدا کچھ کو وہ قوت نہیں حاصل
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد

اور پھر اس عورت نے کہا۔ فقر۔ گمراہی۔ سلطنت اور راحت و آرام کو ٹھکرا کر قید خانے کی مصیبتوں کو کیوں پسند کر رہے ہو۔ دنیا تمہیں کوئی جنت نظر آ رہی ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا۔

تیر بھر پڑ سکوں ہے۔ یہ سکوں ہے یہ فسوں ہے
نہ تنگ جبہ نہ خوف نہ خرابی گلستاں
تو خیمہ آسماں سے بھی آسنا نہیں ہے
نہیں ہے قرار کرتا تجھے غمزہ ستارا

۱۰۵

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ایک روز وہ عورت بندی خانے میں پہنچی۔ اور اپنے محبوب یوسف سے ملاقات کی۔ ملاقات کے دوران میں اس نے اپنے اختیارات کی دنیا کے سبز باغ دکھائے۔ اور کہا کہ صرف ایک ہاں پر اس تاریکی سے میں تمہیں اپنی منور دنیا میں لے جاؤں گی۔ اس کے جواب میں آپ نے کہا کہ تیری دنیا میں:-

ہر خاکی و نوری پہ حکومت ہے خرد کی
باہر نہیں کچھ عقلِ خداداد کی زد سے

عالم ہے غلام اس کے جدلِ ازلی کا
اک دل ہے کہ ہر لحظہ الجھتا ہے خرد سے

ایک رات مصر کے بادشاہ نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا جس کی تعبیر بتانے سے دربار کے اہلِ دانش عاجز آ گئے۔ خواب یہ تھا۔

"دربار میں بادشاہ نے اپنے درباریوں کو جمع کر کے کہا۔ میں خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ سات گائیں ہیں دبلی پتلی سات دبلی پتلی گائیں نکل رہی ہیں۔ اور سات بالیں ہری ہیں اور سات سوکھی۔ اے اہلِ دربار! اگر تم خواب کا مطلب حل کر لیا کرتے ہو تو بتاؤ۔ میرے خواب کا کیا سبب ہے۔ درباریوں نے فوراً کہا کہ یہ پریشان خواب صرف خیالات ہیں۔ کوئی ایسی بات

نہیں جس کا کوئی خاص مطلب ہو۔ سچے خوابوں کا تو مطلب حل کر
سکتے ہیں۔ لیکن پریشان خوابوں کا حل نہیں جانتے۔" ۱۲/۴۴-۴۵
جب اس کا چرچا عام ہوا تو بادشاہ سے ایک شخص نے کہا کہ بندی خانے
میں ایک شخص یوسف نامی ہے۔ وہ اس فن میں ماہر ہے چنانچہ وہ قید خانہ
میں گیا اور یوسف سے کہا۔ کہ تیری سچائی کی بڑی دھوم ہے۔ تو ہمارے
خواب کی تعبیر بتا۔ یوسف نے اس شخص کو بادشاہ کے خواب کی تعبیر بتا دی
اور ساتھ ہی تدبیر بھی بتا دی۔ تب بادشاہ نے اس کی تعبیر اور تدبیر کا حال معلوم
کیا تو یوسف کی تدبیر کے جوہر آشکارا ہو گئے۔ بادشاہ نے اسے بندی خانے سے
آزادی کا حکم بھیجا۔ قاصد حکم لے کر یوسف کے پاس گیا تو یوسف نے کہا کہ بادشاہ
کی جو فرمانی کا شکریہ لیکن میں اس کے رحم و کرم کے صدقے میں یہاں سے
باہر نہیں جاتا۔ پہلے بادشاہ سے کہو کہ میرے معاملے کی تحقیق کرے۔
تاکہ اس کو خواب کی تعبیر بتا دی ہے اور تدبیر بھی اس کے علاوہ ہو سکے
دوسرے شکوک بھی ان سے کبھی واقف ہوں۔

نگاہِ عشق و دل ہر دو کو طے کر
بکر جو منزلوں سے خفی ہوں کہ جا ہی ملیں
بڑھے ہیں مردِ قلندر کی خطرے سے
خدا ہے مجھ کو تیرے شر سے کر میں بچائے
دست بردِ زمانہ سے وہ گزر سے

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا!
غوّاص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے
پیدا ہے فقط حلقۂ اربابِ جنوں میں!!
وہ عقل کہ پا جاتی ہے شعلے کو شرر سے
جس مئے پیچیدہ کی تصدیق کرے دل
قیمت میں بہت بڑھ کے ہے تابندہ گہر سے

قاصد نے جاکر بادشاہ کی خدمت میں لفظ لفظ کہہ دیا۔ دربار کی نظر اس طرف کہ نظر بند کی موت کا وقت آگیا ہے کیونکہ وہ بادشاہ کے مزاج سے آگاہ تھے۔ یہاں قدرت کچھ اور ہی کرشمے دکھا رہی تھی۔ بادشاہ کی جوہر شناس نگاہ نے کندن کو پہچان لیا۔ معاملہ کی تحقیق ہوئی تو یوسف قطعی بے گناہ ثابت ہوئے۔ عزیز کی بیوی نے بھی علانیہ اپنے گناہ کا اعتراف کر لیا۔ اب تو یوسف کی پاکیزگی اور درخشندگی نے ہر دل میں عظمت و احترام کی جگہ بنالی۔ پھر یوسف کو آزاد کیا گیا اور بادشاہ نے کہا کہ اے یوسف ہماری نظروں میں تم بڑے ہی دیانت دار انسان ہے۔ پھر بادشاہ نے کہا کہ سلطنت کے کاروبار میں جو شعبہ پسند ہو اختیار کر لو۔ یوسف نے امورِ سلطنت پر ایک نگاہ ڈالی اور مملکت کے خزانوں کا انتظام سنبھال لیا۔

. . . . . .

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے
وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی
خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی
یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی
یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار
اسی مقام سے آدم ہے مظہرِ سبحانی
یہ جبر و قہر نہیں ہے یہ عشق و مستی ہے
کہ جبر و قہر سے ممکن نہیں جہانبانی!

لطیفۂ عزم

جب قریش کا قافلہ شام سے واپس آ رہا تھا تو کسی نے امیرِ کاروان ابوسفیان کو اطلاع دی کہ مسلمان تمہارے قافلہ کو لوٹنے کی فکر میں ہیں۔ اس خبر کی اطلاع قریشِ مکہ کو بھیجدی۔ وہ پہلے ہی بہانہ کی تلاش میں تھے۔ فوراً مرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اور ایک لشکر جرار لے کر مدینہ کی جانب چل آئے۔

نبی کریم کو معلوم ہوا تو آپ نے اصحابؓ سے صلاح مشورہ کیا۔ ان میں سے ہر ایک نے کہا کہ آپ حکم دیں تو ہم سمندروں میں کود پڑیں۔ اس وقت

ان جاں نثاروں کی کل تعداد ۳۱۳ تھی۔ لیکن قدرت کے نزدیک میدانِ جنگ کی فتح و شکست آدمیوں کی گنتی پر موقوف نہیں ہے آدمیوں کے اعمال صالح پر مبنی ہے۔ پھر یہ جماعت تو خاص خدا کی جماعت تھی۔ اگرچہ خدا کے نام لینے والوں کی کل کائنات یہی گنتی کے ۳۱۳ تھے جو حق و صداقت کے ساتھ اپنے دعوہ ایمان کی شہادت کے لئے چل دیئے تھے۔ اس جماعت کے پاس کل دو گھوڑے تھے۔ ان کے ساتھ ہزار سپاہیوں کی جمعیت۔ سو سوار دس کا رسالہ۔ تمام امرائے قریش شریک تھے۔ رسد کا یہ بندوبست تھا۔ کہ ہر روز دس دس اونٹ ذبح ہوتے تھے دشمن کا جم غفیر دیکھ کر چند اصحاب نے آسمان کی طرف دیکھا تو حضورؐ نے فرمایا کہ آسمان کا مالک اسی کے ساتھ ہے جو زمین پر اپنی حفاظت آپ کرتے ہیں۔

نظر سپر پہ رکھتا ہے جو سنت راشناس
نہیں ہے اپنی خودی کے نظم سے آگاہ

خودی کو جس نے فلک سے بلند تر دیکھا
وہی ہے مالکِ صبح و شام سے آگاہ

سترہ رمضان ۲ھ (مطابق ۱۳ مارچ ۶۲۴ء) کی صبح بدر کے میدان میں حق و باطل کی دو صفیں برسرِ آزما ہوئیں۔ ایک طرف تھوڑے سے ۳۱۳ افراد دو ان کے پاس معمولی ہتھیار ہیں اور صرف دو گھوڑے۔ دوسری صف لشکر عظیم ...

نہ دستِ شمشیریں۔ نہ پورے سامان۔ لیکن ان ۳۱۳ افراد کا یہ عالم تھا کہ ان میں ایک کمسن بچہ (عمیر بن ابی وقاص) تھا جس کے گلے میں اس کے بڑے بھائی سعد بن ابی وقاص نے تلوار حمائل کی تھی۔ تڑپ تڑپ کر صف سے آگے نکل جانا چاہتا تھا۔ کئی بار ساتھیوں نے پکڑ کر صف میں کھڑا کیا۔ اور جب اس سے پوچھا کہ کیا تم سے اتنی بھاری تلوار اٹھ بھی سکے گی؟ تو اس نے جاہ و جلال کے ساتھ جواب میں عرض کیا۔ میں دشمن پر فتح حاصل کرنے آیا ہوں۔ اور اس کے لئے تلوار ضروری نہیں ہے۔

مردِ تو را شمشیر کی حاجت نہیں ہے
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد
تاثیر جہاں میں وہ پر دیر تیر سے آگے
وہ مردِ مجاہد ہے تو غالب و آزاد
مرحوم کی تشریح کیا ہے یہ فقط ذوقِ طلب ہے
پنہاں جو تہِ دست میں ہے وہ دولتِ خداداد

مقامِ ایمان

حالانکہ ایمان سے قوم کو اس کے حقیقی مقام سے چند انگلیوں میں اوشناس کیا ہے۔ اور بیان کیا ہے کہ یہ سب کچھ میرے لئے ہے۔ اور میرے ہی

دم سے بارونق ہے۔

کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی
تو میری نظر میں کافر میں تیری نظر میں کافر
تیرا دیں نفس شماری میرا دیں نفس گدازی !!
تو بدل گیا تو بہتر کہ بدل گئی شریعت
کہ موافقِ نذر رواں نہیں دینِ شاہ بازی !
تیرے دشت و در میں مجھ کو وہ جنوں نظر نہ آیا !
کہ سکھا سکے خرد کو رہ و رسمِ کارسازی !
نہ جدا رہے نوا گر تب و تابِ زندگی سے
کہ ہلاکی اُمم ہے یہ طریقِ نے نوازی !!!

صاحبِ آفاق

اس جنگِ بدر میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ جب مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ دشمن زیادہ طاقت میں آرہے ہیں تو انہوں نے مشورہ کیا کہ جنگ کا فیصلہ میدانِ جنگ میں ہو یا دشمن کو شہر پر حملہ کرنے دیا جائے۔ اور اس کی مدافعت شہر سے ہو؟

اس فیصلے پر بہت سے مسلمان بگڑ گئے اور میدانِ جنگ میں جانے

سے کترانے لگے۔ اور وہ نہیں جانتے تھے کہ اللہ کو حق کی صداقت کے لئے میدانِ جنگ میں فیصلہ کرنا ہے وہ مسلمان جن کا ایمان محکم اور یقین کامل تھا حضورؐ کے ہمراہ ہو گئے اُس وقت حضورؐ کے ساتھیوں نے فرمایا کہ جو لوگ میدانِ جنگ کو پسند کریں گے وہ صاحبِ آفاق ہوں گے۔ کیونکہ بندۂ آفاق ہماری شان نہیں ہے۔

جس بندۂ حق بیں کی خودی ہو گئی بیدار
شمشیر کی مانند ہے برّندہ و براق!!!
اُس کی نگہِ شوخ پہ ہوتی ہے نمودار
ہر ذرہ میں پوشیدہ ہے جو نورِ مشراق
اُس مردِ خدا سے کوئی نسبت نہیں تجھ کو
تو بندۂ آفاق ہے وہ صاحبِ آفاق!
تجھ میں ابھی پیدا نہیں ساحل کی طلب بھی
وہ پاکیِ فطرت سے ہوا محرمِ اعماق

میدانِ جنگ میں جس چیز پر فتح و شکست کا مدار ہے۔ وہ سپاہی کی روح ہے۔ اگر اسے اپنی کامیابی پر یقین ہے اگر جمعیت خاطر نصیب ہے تو میدان مار سکتا ہے یہی وہ دولت تھی۔ یہی تو دل کا اطمینان تھا یہی وہ پختگی راز تھی جو اللہ نے آسمان سے ان کے دلوں میں نازل فرمائی

جسے رحمت کے فرشتے کہہ لیجئے۔ قوتِ آسمانی یا اعجازِ الٰہی۔ بہرحال یہ فتح ایک کرشمہ تھا۔ زندہ خودی کا۔

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی
نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہِ فقیر
خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب
خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیاں و حریر

دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ یہ جماعت اسی وطن کی تھی۔ ان کی رگوں میں بھی وہی خون تھا۔ جو باطل کے لشکرِ جرار کی رگوں میں موجزن تھا۔ پھر ان گنتی کے آدمیوں میں زندگی کی بجلیاں کس نے بھر دیں؟ اس مٹھی بھر جماعت کے سینوں میں فکر و تدبر کا سلیقہ کس نے ودیعت کر دیا تھا۔ یہ وہی وہ فکر و تدبر تھا جس نے سوزِ محمدؐ سے حرارت پائی تھی۔ ورنہ۔

آزادیِ افکار سے ہے ان کی تباہی
رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیِ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ!

اور یہی وہ جماعت تھی جس نے حضورؐ کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی تھی۔ یہی تربیت گاہِ نبیؐ ان کی نہ بجھنے والی نورِ زندگی ہے۔

منور ہوتی چلی گئیں۔

خودی کی پرورش و تربیت پر ہے موقوف
کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز!
یہی ہے سرِّ کلیمی ہر اک زمانے میں!
ہوئے دشت و شعیب و شبانیِ شب و روز

زندہ کرامات[۵۶]

خبر ملی ہے کہ بھارت مشرقی پاکستان پر حملہ کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ اس خبر سے بے ایمان مسلمانوں کے دل ڈوب گئے ہیں۔ ان کے سامنے خود کی تعداد و مادہ قوتوں کی زیادتی ہے۔ لیکن اپنے اندر جوہرِ خودی کی نمود سے قاصر ہیں۔ انہیں باور نہیں آتا کہ حق ہمیشہ باطل پر غالب رہا ہے۔ اگر جنگ صرف حق و صداقت کی حفاظت کے لئے کی جائے تو صرف ایمان والوں کے لئے مفید ہو جاتی ہے۔ لیکن۔ انہیں تو مغرب کی تعلیم نے اس حد تک زندہ حقیقت سے کوسوں دور کر دیا ہے۔ مجربہ نکتہ ان کی سمجھ میں کیسے آجائے۔

. . . . . .

تو اپنی زندگی کا اندازہ کر خود ہی
خودی نہیں تو زمانہ کیا اعتبار تیرا

بہتر ہے کہ بیچارے ہوالوں کی نظر سے
پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال
کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات

آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات

آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور
محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

نشیب و فراز

جنگِ بدر کی حقیقت کے بارے میں اللہ نے سورۂ آلِ عمران میں ارشاد فرمایا ہے۔

"بے شبہ تمہارے لئے ان دو گروہوں میں (حکمِ حق کی فتحمندیوں کی) بڑی بڑی نشانی تھی جو (بدر کے میدان میں) باہم گتھ مقابل ہوئے تھے۔ اس وقت تو ایک گروہ (مٹھی بھر بے سروسامان مسلمانوں کا تھا) اللہ

کی وہیں تر رہتا۔ دوسرا منکرین حق کا تھا جنہیں مسلمان اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ان سے دو چند ہیں رہائیں ہمہ منکرین حق کو شکست ہوئی۔ واللہ جس کسی کو چاہتا ہے اپنی نصرت سے مددگاری پہنچاتا ہے۔ بلاشبہ ان لوگوں کے لئے جو چشم بینا رکھتے ہیں۔ اس معاملہ میں بڑی ہی عبرت ہے۔" (۳/۱۲ ۱۵)

ان دونوں کے گروہوں کی فتح اس لئے ہوئی کہ ان کے ارادوں میں استحکام اور نیتوں میں خلوص آ گئے تھے۔ یہی تخیلات بلند ہوں تو ارادے فتح میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور اگر نشیب میں پرورش پائیں تو زوال کا آئینہ دار ہو جاتے ہیں۔

ستارگان فضا ہائے نیلگوں کی طرح
تخیلات بھی ہیں تابع طلوع و غروب
جہاں خودی کا بھی ہے صاحب فراز و نشیب
یہاں بھی معرکہ آرا ہے خوب سے نا خوب
خود جس کی فراز خودی سے ہو وہ جمیل
جو ہو نشیب میں پیدا قبیح و نا محبوب

مسلمان مقدرت سے فرزند تر کر زوال کے نشیب میں پناہ لے چکا ہے یقینوں کے دامن میں سانس لے رہا ہے۔ اور نفس شماری میں موت کے وقت تعین کا منتظر ہے۔ مسلمان ساری دنیا کا عام مسلمان آج ساری دنیا میں ذلت کی زندگی

بسر کر رہا ہے۔ اسی ذلت کو قرآن نے غلامی سے تعبیر کیا ہے۔ گو کہیں چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے وارث مسلمان ہیں بھی تو ان کا لقب شہنشاہ ہے وہ بادشاہ ہیں۔ وقت کے امیر نہیں ہیں۔ امتوں کے امام نہیں ہیں ان کی سطوت کا دوسرا نام دورِ چنگیزی ہے۔ اور یہ مرض کسی محدود خطہ زمین پر مہلک جراثیم کی پرورش نہیں کر رہا۔ بلکہ مشرق و مغرب میں مزاج کی یہی کیفیت ہے۔

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور
خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام
خودی کی موت سے روسِ عرب ہے بے تب و تاب
بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق و عظام
خودی کی موت سے ہند کی شکستہ بالوں پر!!
فنس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام
خودی کی موت سے پیرِ حرم ہوا مجبور
کہ بیچ کھائے مسلماں کا جامہ و احرام

پیکرِ شکر

جنگ احد میں حضورؐ کے ساتھ سو ہمراہی تھے ان میں سے کمسن بچے واپس کر دیا گیا۔ جب رافع بن خدیجؓ سے کہا گیا کہ تم چھوٹے ہو۔ پھر

چلے جاؤ۔ تو وہ پنجوں کے بل تن کر کھڑے ہو گئے کہ قد بڑا نظر آئے۔ ذوقِ شہادت کی انتہا پر اذنِ معیت مل گئی۔ ایک دوسرا بچہ سمرۃ بھی بضد ہوا کہ جب مجھ میں رافع سے زیادہ طاقت ہے تو مجھے محروم کیوں رکھا جاتا ہے چنانچہ ان کی کشتی ہوئی تو واقعی سمرۃ نے رافع کو پچھاڑ دیا۔ اس بنا پر سمرۃ کو بھی اذنِ معیت دے دی گئی۔ یہ تھے وہ مسلمان اور ان کی گھریلو تربیت کا نتیجہ کہ بچے پیدائشی مجاہد پیدا ہوتے تھے۔ ؎

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے
اس آبجو سے کئے بحر بیکراں پیدا
وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا

عورت اور اسلام

جنگ حنین کی ایک خاتون نے بھی صحابہ حضرت رسول اللہ کے ساتھ روایت ہے کہ جب مشکلیں حرج کے "بلی" تھیں اور زمین اپنی پانی تھی حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے کہ جب بنی الرم کو دشمنوں سے زمین سے لیا تو

آپ نے سپر بن کر حضورؐ کو اپنی اوٹ میں لے لیا اور تیروں کی بوچھار کو اپنے اوپر روکنے لگیں۔ جب حضورؐ کی شہادت کی خبر (غلط خبر) مدینہ پہنچی تو دنا شعار خواتینِ اسلام بے تابانہ گھروں کے اندر سے نکل آئیں، اور میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہو گئیں۔ حضرت حمزہؓ کی شہادت کی خبر سن کر اُن کی بہن حضرت صفیہؓ میں تو حضورؐ نے لاش پر جانے کے لئے روک دیا کہ شاید لاش کو ہی بھی دیکھ کر ضبط نہ کر سکیں۔ لیکن انہوں نے بڑے استقلال سے فرمایا کہ مجھے سب حال معلوم ہو چکا ہے۔ یہ خدا کی راہ میں کوئی بڑی قربانی نہیں ہے میں خود قربان ہونے کے لئے تیار ہوں۔ چنانچہ ضبط کا یہ عالم دیکھ کر حضورؐ نے اجازت دیدی۔ آپ لاش پر گئیں اور لاش کے منتشر ٹکڑوں پر فاتحہ کہہ کر چپ چاپ واپس چلی گئیں۔ یہ سب اسلام کی تعلیم کا فیض تھا۔ ورنہ اُس زمانہ کی کافر عورتیں خونخواری میں مشہور تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب نورِ اسلام انسان کے وجود کو روشنی بخشتا ہے تو پھر اللہ کی رضامندیاں چھپی نہیں رہتی۔

تیری خودی سے ہے روشن تیرا حریمِ وجود
حیات کیا ہے اُسی کا سرور و سوز و ثبات
بلند تر مہ و پرویں سے ہے اُسی کا مقام
اُسی کے نور سے ہیں نیر سنوں کی صفات

. . . . . .

جہنمی

کی جنگ میں مسلمانوں کی طرف سے قزمان نامی شخص لڑا، اور کفار قریش کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ اکیلے نے سات آٹھ مشرکوں کو قتل کیا۔ آنحضرت اس کی دلیری پر خوش ہوئے، اور حیران ہوئے کہ حضورؐ کا فیصلہ کیا ہے کہ یہ شخص جہنمی ہے۔ لیکن آج تو یہ جنت کا مالک نظر آتا ہے۔ چنانچہ صحابہؓ اس کے پاس گئے دیکھا زخم کھا کر گر پڑا تھا۔ صحابہ نے مبارک باد پیش کی اور شہادت دی کہ اس نے مسلمانوں کی خاطر بہت بڑا کام کیا ہے۔ اس پر قزمان نے کہا یہ تو کوئی بڑا کام نہیں ہے۔ یہ تو مکہ اور مدینہ کی باہمی جنگ تھی میرا فرض تھا کہ میں اپنے وطن کی طرف سے لڑوں آپ کی جگہ کوئی اور ہوتے تو یہی میں بھی کرتا۔ مجھے قومی حمیت نے جوش دلایا میدان میں نکل آیا، اور وطن کے دیوتا پر قربان ہو گیا۔ اب اصحابہؓ کی سمجھ میں آیا کہ اللہ کی راہ میں سر کٹنے اور وطنیت پر سر کٹنے کا کتنا بڑا فرق ہے اور وہ مرنے والا واقعی جہنمی ہے۔ جب تک نیت اور ارادہ نیک نہ ہوں۔ کوئی عبادت بھی نہیں ہو سکتی۔ اور یہی صالحیت خودی کا نور ہے۔ اسی بہشت خودی کی تعبیر ہے ؎

ہے کہ جز یزدانِ کتا شر و تبری نبود
آں بہشت کہ بیاں حضرت وجود!

گر مزہب نہیں تعمیرِ خودی کا جوہر
وائے صورت گری و شاعری و نائے و سرود

اسلام اور آرٹ

یہ موضوع اس قابل ہے کہ اس پر الگ ایک کتاب لکھی جائے۔ لیکن اس وقت اسے فقط علامہؒ کی نگاہ تک محدود رکھنا بہتر ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ حسنِ معاملہ میں ایک دوسرے سے احسان کرو۔ اسی ایک لفظ "احسان" میں ساری تفسیر سمٹ کر آ گئی ہے۔ مثال کے طور پر آپ ایک فوٹو گرافر سے پاس تصویر کھنچوانے جاتے ہیں۔ دو روپیہ پر معاملہ ہو جاتا ہے۔ اب اس اجرت میں یہی کافی تھا کہ وہ آپ کو پہلا عمل (ایکٹو) دیدے۔ لیکن وہ اس کے بعد پرفیکٹ اکزاکٹ ہے اور پھر اپنے علم و ہنر و فنِ تصویر کشی کے جوہر عطا کرتا ہے جب وہ دیدہ زیب ہو جاتی ہے تو آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ اسی کا نام احسان ہے۔ اسلام نے آرٹ کا احترام کیا ہے۔ لیکن اس حد تک کہ تصویر مصور کے فن کی منت پذیر رہے مصور یا کوئی دوسرا اس میں جذب نہ ہو جائے۔ اس جذب ہونے کا نام شرک ہے اور بنظرِ اس وقت راقم ہوتا ہے جب مصور کی خودی بلند نہیں ہوتی۔

کس درجہ ہیں ہم جدتِ مرگِ تخیل
ہندی ہیں خیالی کا مقلد بھی ہوا ہے

مجھکو تو یہی غم ہے کہ اس دور کے بہزاد
کھو بیٹھے ہیں مشرق کا سرورِ ازلی بھی

معلوم ہیں اے مردِ ہنر تیرے کمالات
صنعت تجھے آتی ہے پرانی بھی نئی بھی

فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھی بھی ہے تو نے
آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی!

سامان موت

آزاد وہ ہے جس نے اللہ کی اطاعت کے علاوہ کسی کی اطاعت قبول نہ کی ہو
زندگی سے کبھی گریز نہیں کرتا۔ چاہے یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی موت
کے سامان میں کوئی قسم کی ذلت ہو۔ وہ خوش ہوگا کہ اس کی موت عمدہ۔ آزاد اور
بلند ذہن ہستیاں ہیں آئے۔ وہ کند ذہن، کاہل اور دوسرے چھوٹی سے ذہن کے ہوتے
ہیں۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ ان کی خودی کا تقاضا ہو کہ تلوار نہایت حسین
ہو اور دستانے تک بہت نفیس میں جلال بھی ہو۔ اور زبان
ہو۔

زندگی بلند تھی اس خود گرفتہ پر کی
اب تجھے سے بلند ہے وہ تعزیہ

ٹھہر ٹھہر کہ بہت دلکشا ہے یہ منظر
ذرا میں دیکھ تو لوں تاب کی شمشیر

انقلاب

حضرت علامہؒ نے دورانِ یورپ میں نفسیات کا مطالعہ کیا۔ اس سے آپ مشرقی زاویہ نگاہ سے بخوبی آگاہ ہو چکے تھے اور نہایت مایوس ہوئے تھے۔ انہیں کچھ امید تھی کہ یورپ میں زندہ قومیں ہیں شاید وہاں ہی انسانیت کی جھلک نظر آئے۔ لیکن وہاں جا کر بھی مادی انقلاب کی شورش نظر آئی۔ دیکھا کہ دنیا موجودہ نظام سے تنگ آئی ہوئی ہے۔ اور کوئی نیا دور اس کی جستجو کا شکار ہونے والا ہے۔ علامہ کی نگاہ دور رس نے دیکھ لیا کہ وہ نیا دور بھی انسانیت کی حدود سے بہت دور ہوگا۔ اس انقلاب میں چند لیڈروں کی موت ہوگی۔ چند ہستیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن نظامِ شیطانیت اسی انداز سے مسلط رہے گا۔ کوئی خدا کا راز داں نہ یہاں ہے نہ وہاں۔

نہ ہیں یہاں نہ یورپ میں سوزِ ساز حیات!
خودی کی موت ہے اندوہ و ضمیر کی موت
دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا
قریب آ گئی شاید جہانِ پیر کی موت

بلند کردار

جنگ احزاب میں کفار نے حضرت خبیب کو گرفتار کر لیا اور جب کہ اہل مکہ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ حضرت خبیب نے جنگ بدر میں حارث بن عامر کو قتل کیا تھا۔ خبیب اس کے لڑکوں نے خرید لیا کہ یوں اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لے سکیں گے۔ چند مہینے گزرے تھے کہ ایک روز باہر لے گئے اور کہا کہ قتل ہو جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ آپ نے کہا کہ مجھے صرف نماز ادا کر لینے دو۔ وہ مان گئے۔ حضرت خبیب نے زندگی میں پہلی بار نماز کو جلدی جلدی ختم کیا اور نماز سے فارغ ہو کر آپ نے فرمایا تھا کہ اللہ کی نماز اطمینان سے ادا کروں جبکہ یہ میری آخری نماز تھی لیکن مجھے خوف تھا کہ تم میرے متعلق بدگمان نہ ہو جاؤ۔ اس لئے تھوڑی سے لمبی نماز لمبی کر دی ہے۔ اللہ اکبر۔ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اس قدر اطمینان قلب ہے یہ صرف تعلیم صحابہ کی یہی حکم ہے جس سے حاصل ہو سکتی ہے۔ دیگر تمام ایمان کو دوسروں میں تبدیل کر دیا جائے تو انسان کی خودی ختم ہو جاتی ہے۔ جیسے انگریز نے کہا ہے۔

"ہم کے تیرے میں ڈال کر اس کی خودی کو

ہو جائے ملا تو جدا شرع سے پیر"

تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

رُوحِ مضطرب

نبی اکرمؐ نے جن اضطراری حالات میں مکہ کو چھوڑا تھا وہ سب پر عیاں تھا۔ مکہ چونکہ حرکت و عمل اور تمام تگ و تاز کا مرکز اور منتہیٰ تھا اس لئے مدینہ میں آنے کے بعد بھی وہ حضورؐ کی تمناؤں کا مرکز اور مہاجرین کی آرزوؤں کا محور بنا رہا۔ آپؐ کا جسم یہاں تھا لیکن روح وہاں تھی۔ مہاجرین کی ہر نگاہ کا تار اسی قبلہ مقصود سے وابستہ تھا۔ ان کے دل کی ہر خلش اسی مرکز سے ہم آہنگ تھی۔ انہیں یقین کامل تھا کہ یہ قافلہ ایک نہ ایک روز دوبارہ فاتح کی حیثیت سے اپنے مرکزِ حیات میں داخل ہوگا۔ یہ قافلہ جب تک مدینہ میں رہا ایک سانس بھی تو خودی کی پرورش سے غافل نہیں رہا۔ یہی وہ چیز تھی جس نے پھر انہیں خانہ کعبہ کی کنجیوں کا مالک بنا دیا۔

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و پاخت و خود بینی ہے

خدا کا ہاتھ

حضورؐ نے مدینہ کا اردہ کب کیا؟ اس کے بعد کے حالات چھوڑ دو جو صحابہؓ نے بھی ترجمہ

بلند دیا۔ چنانچہ یہ کاروان شوق دیارِ محبوب کی جانب روانہ ہوا۔ اس قافلہ کی اطلاع قریش کو ملی تو وہ خواہ مخواہ جنگ کی تیاریاں کرنے لگے۔ حضورؐ نے ملا بھیجا کہ ہم عمرہ کی نیت سے آئے ہیں۔ اور پھر عرب تو اس ماہ میں لڑائی نہیں کرتے۔ لیکن قریش نے ایک دستہ فوج کا بھیجا۔ یہ دستہ آسانی سے مسلمانوں سے قید کر لیا۔ لیکن ان کے معافی مانگنے پر انہیں رہا کر دیا گیا۔ یہ بھی مسلمانوں کے حسنِ عالی کی دلیل تھی۔ اس کے بعد غنتوں نے صلح کے لئے حضورؐ نے حضرت عثمانؓ کو بھیجا تو قریش نے انہیں گرفتار کر لیا۔ یہ انتہائی بدعہدی تھی۔ اور پھر مشہور کر دیا کہ حضرت عثمانؓ کو شہید کر ڈالا گیا ہے۔ یہ خبر سنکر حضورؐ نے اصحاب کو جمع کیا۔ اور ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ کر بیعت لی۔ انہوں نے حضورؐ کی شہادت تک اس کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اور صدق وفاداری اٹھایا کہ خدا کی راہ پر سب کچھ قربان کر دیں گے۔ اس زندگی کے انقلاب نے خدا کو مجبور کر دیا کہ انصرت و تائید ان کے مقدر میں لکھ دے۔

تیرے خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے

بھوک اور ایمان

سوم۔ دو سیاسی جماعت یا اجتماعی نظام دنیا کی قوم قوتوں پر لیول غالب

ہے ؟ اس کے نظام کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جو اس کے حلقے میں آجائے حکومت کا فرض ہو جاتا ہے کہ اس کی ضروریات کا خیال رکھے۔ حکومت کا یہ فرض کہ تمام مومنین کی ضروریات کا خیال رکھے۔ اور ہر مومن کا یہ ایمان کہ اس کا سب کچھ اللہ (حکومت) کے لئے ہے۔ پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ اس نظام کے ماتحت کسی گھر کے چولھے میں آگ نہ جلے۔ جونہی یہ نظام ختم ہوا دنیا دو طبقوں میں منقسم ہو گئی۔ بھوک اور امارت کے دو طبقوں میں۔ اور جب روٹی کے ذریعہ کسی کے قبضے میں آجائیں تو وہ دوسرے انسانوں کی گردنیں اپنے حضور میں جھکا سکتا ہے۔ اسی غیر الٰہی قوتوں کے سامنے جھکنے کا نام شرک۔ کفر اور بے ایمانی ہے۔ اسی نظام میں افلاس کا دور دورہ ہوتا ہے۔ اور یہی حاجت انسانوں کو غلامی پر مائل کر دیتی ہے۔ شیروں کو لومڑی بنا دینا اس حاجت کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے

حاجت سے مجبور مردانِ آزاد
کرتی ہے حاجت شیروں کو روباہ

محرم خودی سے جس دم ہوا فقر!!
تو بھی شہنشاہ میں بھی شہنشاہ!

رسمِ تطہیر

سنت کیا ہے؟ نبی اکرمؐ۔ دیگر پیغمبروں اور اصحاب کرامؓ کی مقدس زندگی

روایت و خصائل کی تقلید۔ یہ تقلید خواہ کتنی ہی کہنہ کیوں نہ ہو۔ ہر زمانے میں حیاتِ نو کی تعمیر کا سنگِ بنیاد ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے علامہ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ مسلمان کو اس تقلید پرستی سے غافل نہیں رہنا چاہیئے۔ یہ جذبہ بڑا حسن ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی تاکید فرمادی ہے کہ تقلید صرف اسلامی دستورِ حیات کی واجب الاحترام ہے ورنہ دورِ حاضرہ کی تقلیدِ فرنگ ایک زہر ہے۔ ہم قائل ہیں۔

"تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ
لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ

اے کاش لعنتِ

ہندوستان۔ نوجوانو! اگر کہیں قومی غیرت کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں تو افغان قبائل کے آزاد جیالوں میں۔ انگریز کے تمام جتن بے بس ہو کر رہ گئے مگر یہ آزاد قبائل غلامی کے آستاں پر سر نہ جھکا سکے۔ انگریز نے دوسرا حربہ استعمال کیا۔ یعنی تہذیب کے جراثیم ان میں داخل کرنے شروع کئے۔ مگر یہ بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ اس نے ہندو ذہنیت سے کام لیا۔ کانگریس کے دباؤ

خیالات ان تک پہنچائے گئے اور وطن کا راگ الاپ کر انہیں اپنے زمرے میں شریک کر لیا۔ بظاہر انہیں انگریز کے خلاف اکسایا گیا۔ یہ بھولا مسلمان آزادیٔ وطن کے فریب میں آگیا۔ اور کانگریس کے دامِ فریب میں پھنس کر اپنی خودی کو گرفتار کروا بیٹھا۔ اس کا اسے احساس تک نہ ہوا۔ عبدالغفار خاں ان کا پیشوا مقرر کر دیا گیا۔ اس ملّت فروش انسان نے اسلامی جوہر کو کانگریس کے تیزاب میں ڈال کر گوہرِ خودی کی آب و تاب کو اس طرح نابود کیا کہ ان کے سینوں میں خودی کی ایک کرن تک باقی نہ رہی۔ اور یہ تمام سرحدی علاقہ جس کی غیرت و حمیت پر مسلمانانِ ہند کو ناز تھا ہندی بن کر رہ گیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ایک طرف تو ان کی طاقت ختم ہونے سے انگریز مطمئن ہو گیا اور دوسری طرف ملّتِ اسلامیہ کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ کے انتہائی دشمن ہو گئے۔ مسلم لیگ انہیں برادرانہ دعوت دیتی رہی۔ اور وہ اس تحریک کو پامال کرنے میں ہمہ تن مصروف رہے۔ چونکہ اس کی وہ ملی غیرت جس کی تپش سے باطل خاکستر ہو جاتا ہے کسی منظم سازش کے دباؤ میں آکر دب چکی تھی۔ اس لئے اسے قومی اور ملی تنظیم کا احساس تک نہ ہوتا تھا۔ اس کی اس موت سے متاثر ہو کر حضرت علامہؒ نے اس آزاد قوم کے غیرت مند نوجوانوں کو مخاطب کیا۔

رومی بدمشقی ہند سے بولا ہندوستان
تو ہی اے فرزندِ کہسار اپنی خودی پہچان!...

اپنی خودی پہچان او غافل افغان!

تو ہم اچھا پانی دانہ مٹی بھی زرخیز
جس نے اپنا کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان

اپنی خودی پہچان او غافل افغان

اونچی جس کی لہر نہیں ہے وہ کیسا دریا
جس کی موجیں تند نہیں ہیں وہ کیسا طوفان

اپنی خودی پہچان او غافل افغان

ڈھونڈ کے اپنی خاک میں جس نے پایا اپنا آپ
اس بندے کی دہقانی پر سلطانی قربان:

اپنی خودی پہچان او غافل افغان

تیرے سب علموں نے رکھ لی بے علموں کی لاج
عرفانِ نفس ہے تیرے ہیں پانی دین ایمان

اپنی خودی پہچان او غافل افغان!

قوم کی طاقت

اب تک یہ کتاب [illegible] سے [illegible] سے [illegible] سے [illegible] کے [illegible] ہیں۔ [illegible]

خودی کی روح ہے وہ صرف مسلم کے لئے مخصوص ہے۔ اس کی تشریح سمجھ لیجئے تاکہ بات سمجھنے میں آسانی ہو۔ خودی نام ہے انسانیت کی معراج کا اس کے عناصر پر غور فرمالیں۔ زندگی کے مدارج مختلف ہیں۔ ہر درجہ تک پہنچنا اور پہنچنے کے ارادے کا نام نصب العین کا تقرر ہے۔ گویا آپ نے ایک نصب العین قائم کرلیا یہ خودی ہے۔ ہر چیز زندگی کے ساتھ زندہ رہے گی۔ اور ہر زندگی کوشش پیہم کا نتیجہ ہے نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے مسلسل کوششوں کا اس وقت تک جاری رہنا جب تک کہ نصب العین حاصل نہ ہو جائے زندگی ہے اور یہی سعیِ پیہم خودی کی زندگی ہے۔ ہم اس ایک نصب العین کو حاصل کرکے ایک درجہ تک پہنچے ہیں اگر ہم نے اس ایک درجہ پر قناعت کرلی تو ہم نے خودی کا گلا گھونٹ دیا۔ کیونکہ اس کے بعد ہم نے کوئی دوسرا نصب العین تعین نہیں کیا اور بے نصب العین انسان مردہ ہے۔ اگر یکے بعد دیگرے نصب العین تعین کرتے رہے، درجہ بدرجہ نصب العین کے حصول کے لئے سعیِ پیہم کے تسلسل کی کڑیوں کو جوڑتے چلے گئے تو ہم نے حیات خودی کی حفاظت کی اس پر آپ خود کہیں گے کہ تنہا تو ہر مسلمان کر نہیں سکتا ہے پھر مسلم اور غیر مسلم میں کونسی شے باعث تخصیص ہوئی؟ سنئے۔ مسلم وہ ہے جو اللہ کے ہاتھ پر بیعت کرچکا ہو یعنی اپنا سب کچھ مرکز کے پاس جمع کردیا ہو۔ اس کا کچھ نہ رہا ہو سب کچھ اللہ کا ہوچکا ہو۔ اس کی زندگی وحدت کی حفاظت کے لئے ہو۔ اس کی موت خدا کے قوانین کی پاسبانی کے لئے ہو۔ ...

ہر نصب العین مرکز کی تعمیر کے ماتحت ہو اس کی ہر کوشش کا راستہ صراطِ مستقیم ہو اس کا ہر عمل اللہ کی متعین حدود کے اندر ہو۔ ان قیود کا وہی شخص پابند ہو سکتا ہے جو مسلم ہو۔ صاف ظاہر ہے کہ غیر مسلم اپنے سماجی قوانین کا احترام کرے گا۔ اور اپنی زندگی دستور کے ماتحت بسر کرے گا۔ اس کا ہر نصب العین ذاتی نفس پر ایک جزیہ ہو گا۔ اس کی ہر کوشش میں دوسروں کا زیاں پوشیدہ ہو گا۔ یہ آفاق میں گم انسان اسی کوشش میں رہے گا۔ کہ میں سب کو کچل کر میں سب پر غالب آ جاؤں۔ اور یہ "میں" اس مقام و غرور کا ترجمان ہے۔ اور یہی تخیل خیر سے دوری ہے۔ اسی کی بیخ کنی کے لئے اسلام آیا تھا۔ اب آپ نے دیکھ لیا کہ مسلم کے نصب العین اور غیر مسلم کے نصب العین میں کس قدر فرق ہے۔ ان دو مختلف تخیل کی علامہ نے ارشاد سے وضاحت ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

مہر و مہ و مشتری چند نفس کا فروغ
عشق سے ہے نیلگوں تیری خودی کا وجود
تیرے حرم کو ہے سود اجر سے پاک
تیغ ہے تیرے سر خ و سپید و کبود
تیری خودی کا غیب معرکۂ ذکر و فکر!!
تیری زمیں کا تنور طاقت شعر و سرود

روح اگر ہے تری رنج غلامی سے فرار
تیرے ہنر کا جہاں دیر و طواف و سجود!!
اور کرا خیر اپنی شرافت سے لہو
تیری سپہ انس و جن! تو ہے امیر جنود

نظام اسلام نے جو حکومت کے ذمہ یہ فرض لگا دیا ہے کہ وہ ایک ایک فرد کی پاسبان ہے اس سے انسان فکر معاش سے آزاد ہو جاتا ہے اور صرف اپنے رزق (اللہ) کے آستاں پر جبیں سائی کرتا ہے۔ لیکن انگریز نے اسی انسانی کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور نظام اسلام کے خلاف رزق کے ذریعے اپنے قبضے میں لے کر انسان کو فکر معاش دے کر غلام بنا لیا۔

عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تیری دے کے تجھے فکر معاش!
دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے تیرا
زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوق خراش

رفتہ رفتہ اسلام کی تابندگی چھننے کا یہی ایک طریقہ تھا کہ درسگاہوں سے تعلیم و تربیت اسلامی ختم کر دی جائے اور اس کی جگہ انگریزی تمدن کو رواج دیا جائے۔

مقصد ہے گر تربیت لعل بدخشاں!!
سب سود ہے پتھر کے عوض شہر کا شہر!

دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار
کیا مدرسہ کیا مدرسہ والوں کے تگ و دو!
گر ہستہ کنند جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

انگریز کی یہ سازش، ناکام پوری ہوئی کہ اس نے مدرسوں کو امداد اور معافی وظائف دینے شروع کر دیئے۔ بھلا روپے کی کسے ضرورت نہیں ہوتی؟ انگریز نے یہ ڈال رکھا کہ بڑے بڑے پرہیزگار گر پڑے۔ چنانچہ وہ درسگاہیں جن میں خالص اسلام کی تعلیم، دینی علوم کی تربیت دی جاتی تھی، انہوں نے اس بھیک کے لئے اپنا دین بیچ دیا اور عرض گذار ہوئے کہ ہمیں بھی سرکار کی طرف سے امداد ملے۔ اس طرح انگریز نے تمام اسلامی درسگاہوں کو انگریزی تمدن میں جذب کر دیا اور پھر یہی پاسبان حرم اسلامی تعلیمات میں تبدیلی کرنے لگے۔ تو اقبال نے کہا۔

تجھ کو معلوم نہیں ہے ان حرم کے انداز!
ہو نہ محسوس تو دعوت نظر آتا ہے دراز
دیر ہے کیسا کا نظام تعلیم!
ہے یہ سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف
اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف

پھر علامہؒ نے اہلِ مشرق کو پکار پکار کر کہا کہ یہ ہنر، یہ سیاست، یہ علم اور کتابیں اگرچہ موتی ہیں لیکن ان کے انداز اچھے نہیں ہیں اگر ہو سکے تو ان علوم و فنون کے ساتھ ساتھ اپنی شخصیت کو بھی قائم رکھو کہ یہی عین حیات ہے

سرودِ شعر سیاست کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں مقامِ یک دانہ
ضمیرِ ہندِ نما کی ہے نمود ان کی!!!
بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی!
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

ان درسگاہوں میں انگریز نے مشین کی تعلیم شروع کی دورِ حاضرہ کے تقاضوں کے ماتحت تعلیم گرچہ اشد ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انگریز نے ذہن میں یہ بٹھانا شروع کیا کہ ہماری سائنس قانونِ فطرت کے پرخچے اڑا کر بہت آگے بڑھ رہی ہے۔ یہی وہ فساد تھا جس سے اسلام کو خوفِ خدا اور وہی فساد ذہن نشین کر دیا گیا۔ کسی اللہ کے بندے نے قرآن کو ان کر نہ سمجھایا کہ یہ دیکھو انگریز کی سائنس کے سر چشمے ہمارا بندہ مومن اور قرآن نزدیک ہے اس کا علم ستاروں سے اوپر اور سمندروں کے تہ تک آگاہی دیتا ہے ہماری تعلیم یافتہ نوجوان نسل مشین سے متاثر ہو کر سیاہ و سفید بن گئی۔ یہ علم

فردوسِ نظر تھا۔

ہے یہ فردوسِ نظر اہلِ ہنر کی تعمیم
فن ہے چشمِ تماشا پہ نہ خود ذات میں ہے
نہ خودی ہے نہ جہانِ سحر و شام کے دور
زندگانی کی حریفانہ کشاکش سے نجات
آدمی کا نہ بپے رہ کہ ہیں اس کے صنم
قصرِ فرنگ کے وہی ٹوٹے ہوئے لات و منات
ٹوٹے ہیں یہ ہنر تیرے جنازے کا امام
نظر آتی ہے تجھے مرقد کے شبستاں میں حیات

علامہ اقبالؒ نے اس مغربی تعمیر میں صرف جمال کی رعنائیاں محسوس کیں لیکن جلال کا کہیں سراغ نہ ملا۔ جلال تو سراسر غیرت سے شرافت سے نہ رعنائی خودی کے بہت سے حساس تھے۔ اس حسن و جمال کو دیکھ کر آپ نے فرمایا کہ:۔

میرے لئے ہے نظارہ دیدہ بینا کا
تیرے نصیب فراطور کی تجلی ادراک
میری نظر میں ہے جمال و زیب کی
کہ سر بسجدہ ہیں نوت کے سامنے افلاک

نہ جلال تو، سن و جمال بے تاثیر
نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ تشویش ناک
مجھے سزا کے لیے بھی نہیں قبول وہ آگ
کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بیباک

مغربی تمدن نے مرد اور عورت دونوں کے لیے حسن و جمال کی زیبائش کے تمام سامان فراہم کر دیئے۔ اور نت نئی ایجادات سے ان میں اضافہ کرتا چلا گیا اور وہ روح نیست جس کا دوسرا نام اخلاق و شرافت ہے مسلمان کے گھروں سے لوٹ کر لے گیا۔ علامہ نے اس تباہی کو دیکھا اور کہا :-

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا !!!
ان کے اندیشہ تاریک میں قوموں کے مزار
موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں
زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار !!
چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

علامہ نے یہ نہیں کہا کہ فلم موسیقی حرام ہے یہی موسیقی تھی جس کی آہنگ نے جنگ کے میدانوں کو سرنگوں اور ندم کر دیا تھا۔ اس سے راگوں میں غیبت کا ہو دو ہاتا تھا لیکن موسیقی جب انگریز کے تمدن میں بدل کر آئی تو اس نے

عیاشی رہ گئی۔ اور ایسی دھنیں رہ گئیں جن سے لہو سرد ہو اور زندگی کی جدوجہد
بزدلی کی سلیں بن جائیں۔ موسیقی پر ہی کیف موقوف ہے۔ ہر وہ آواز جو زندگی
کو ٹھنڈا کرنے میں موثر ہو حرام ہے۔

وہ نغمہ سردیِ خونِ غزال سرا کی دیں
کہ جس کے سن کے تیرا چہرہ تابناک نہیں

نوا کو کرتا ہے موجِ نفس سے زیر و زبر
وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں

موسیقی کے ساتھ مغرب نے اپنے تمدن کا حصہ رقصِ بدن بھی مشرق کو عطا کیا۔
انگریز نہایت پالاک اور دنش ہے۔ اس رقص کو پہلے پہل مشرق میں اس نے
اپنی مخصوص سوسائٹیوں تک محدود رکھا اور غیر مذہبوں پر پابندی بھی لگا دی گئی
آہستہ آہستہ پابندی تو اٹھا لی لیکن خصوصیت کو ختم نہ کیا۔ پہلے تو مشرق نے صرف
تماشائی کی حیثیت سے حصہ لیا اور پھر یہ ذوق اس کے اندر بھی کروٹ لینے
لگا۔ اور گوری گوری پنڈلیوں والی برہنہ ذہن برہنہ عورتوں کے ساتھ یہ بھی رقص بدن
میں شریک ہو گیا۔ پھر اس رقص کو فیشن کا لباس پہنا کر ریاست کے ایوانوں میں
پیش کیا۔ اور مردوں کے علاوہ مشرقی خاتون نے بھی حصہ لیا۔ مرد کی تن پروری
کے ساتھ ان کی خصوصیت بھی گئی۔ حتیٰ کہ یہ مشرقی آرامگاہوں اور ڈرائنگ روموں میں پہنچا۔
قرآن نے مشرق کو اس فتنہ سے آگاہ کیا۔ اور مشورہ دیا کہ:

چھوڑ یورپ کے لئے رقصِ بدن کے خم و پیچ
روح کے رقص میں ہے ضربِ کلیم اللہی!
صلہ اُس رقص کا ہے تشنگیِ کام و دہن!!
صلہ اِس رقص کا ہے درویشی و شاہنشاہی

ان مدرسوں اور درسگاہوں کی تعلیم کا یہ نتیجہ ہوا کہ مشرق "ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی" کے مسائل میں الجھ کر رہ گیا۔ مشرق میں دو جماعتیں بن گئیں۔ اور یہ موضوع مستقل بحث کے لئے تجویز کر لیا گیا۔ چنانچہ آج تک اُس سانپ کی لکیر کو پیٹا جا رہا ہے اور نہایت نظم و نسق کے ساتھ ہر جماعت اپنے دعوے کے دلائل میں پیش پیش ہے۔ انگریز نے ان نوجوانوں کی ذہنیتوں کو ایسے عمدہ انداز سے الجھایا ہے کہ چھٹکارا مشکل ہو گیا ہے۔ تگ و دو کی جانب ان کی توجہ مبذول ہی نہیں ہوتی۔

یہ مدرسہ یہ کھیل یہ غوغائے روارو!!
اِس عیشِ فراواں میں ہے ہر لحظہ غمِ نو!!
وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جو
نادان۔ ادب و فلسفہ کچھ چیز نہیں ہے
اسبابِ ہنر کے لئے لازم ہے تگ و دو

پیامِ نصرت

مکہ سے نکلتے وقت ان مہاجرین کے راستے میں تاریک مایوسیاں اور ظلمت انگیز ناامیدیاں تھیں لیکن وہ اس تاریک ہجوم کو چیرتے ہوئے مدینہ کی جانب چلے گئے۔ دور افق سے اس پار ایک بے صوت صدا تھی۔ جو اپنے دلکش نغمہ میں اس بے سروسامان جماعت کے کانوں تک نغمہ روح افزا پہنچا رہی تھی کہ:۔

بے جرأتِ رندانہ ہر عشق ہے روباہی
بازو ہے قوی جس کا وہ عشقِ بداللہی!
جو سختیِ منزل کو سامانِ سفر سمجھے!
اے وائے تن آسانی نہ پیدا ہے وہ راہی
وحشت نہ سمجھ اس کو اے مردکِ میدانی
کہسار کی خلوت ہے تعلیم خود آگاہی!!

جب یہ قافلہ راہ کی سختیوں سے تھک کر ذرا نقاہت محسوس کرتا تو استقبال پکار پکار کر کہتا:۔

فولاد کہاں رہتا ہے شمشیر کے لائق!!
پیدا ہو اگر ان کی طبیعت میں حریری

ان کے ارادوں میں استقلال، اور ان کی روح میں تازگی آجاتی۔ نگاہ پھر اپنی بے سروسامانی پر جاتی تو وہ دل مسوس کر رہ جاتے۔ وہ ضروریاتِ زندگی کی تمام چیزیں مکہ میں چھوڑ کر چلے آئے تھے۔ انہیں خیال آتا کہ وہ تمام چیزیں، از سرِ نو کیونکر فراہم ہوں گی تو عزم کہتا:۔

خود دار نہ ہو فقر تو ہے قہرِ الٰہی
ہو صاحبِ غیرت تو ہے تمہیا امیری

کبھی کبھی سفر کی صعوبتوں سے تنگ آکر اُن کا جی چاہا کہ آنحضرتؐ کی خدمت میں شکایت کریں لیکن انسانیت نے یہ کہہ کر منہ بند کر دیا کہ:۔

جو فقر ہوا تلخیِ دوراں کا گلہ مند !!!
اُس فقر میں باقی ہے ابھی بوئے گدائی

یہ تمام چیزیں ایک طرف تھیں اور حضور اکرمؐ کا یقینِ محکم ایک طرف تھا نہیں معلوم تھا کہ تمام تاریکیاں کافور ہو جائیں گی۔ انہیں یقین تھا کہ ظلمتوں کے بادل چھٹ جائیں گے۔ اُن کا ایمان تھا کہ پھر ایک روز ہم مکہ کے دروازہ کی کنجی کے مالک بنا دیئے جائیں گے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ اس ایک صاحبِ یقین کی ہمت نے اس لئے ہوئے قافلے کو پھر زمینِ مکہ کا وارث بنا دیا۔

جگ اس کی چٹکی دیتی ہے پرنا ڈ پیر کو!
رکھتا ہے ایک مُشتِ خاک صاحبِ یقیں۔

فتح خیبر

اقبال، ورمران

حدیبیہ سے واپسی پر حضورؐ کو معلوم ہوا کہ یہودی ہم پر حملہ کرنے کے لئے ادھر ادھر کے یہود سے ساز باز کر رہے ہیں اب یہ وقت انتظار کا نہ تھا چنانچہ آپ نے خیبر کا رخ کیا۔ اس وقت آپ کے ہمراہ چودہ سو پیادہ فوج اور دو سو سوار تھے۔ جب آپ خیبر کے سرحد میں پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ رات کو حملہ کرنا آپ کی عادت میں نہ تھا۔ اس لئے وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ بستی سامنے نظر آ رہی تھی۔ آپ کے سینے میں مومن کا دل تھا جنگ و جدل کے ساتھ ساتھ اللہ سے امن اور سلامتی مانگنا مومن ہی کا کام ہے چنانچہ آپ نے اس بستی والوں کے لئے دعا مانگی کہ :-

"اے خدا ہم تجھ سے اس بستی کی اور بستی والوں کی ہر شے کی بھلائی چاہتے ہیں اور ان سب کی شرارتوں سے تجھ سے پناہ مانگتے ہیں۔" (بحوالہ ابن ہشام)

اس وقت اگر آپ چاہتے تو رات کی تاریکیوں میں سوتے ہوئے دشمنوں پر حملہ کر کے ان کی جان و مال حاصل کر لیتے لیکن ان کی سب قوتوں میں تندی و درندگی نہیں تھی بلکہ شرافت تھی۔

. . . . . .

خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں!
جو ناز ہو بھی تو بے لذتِ نیاز نہیں!

ابی لہب

رؤسائے قریش میں عتبہ، ابوجہل، ابوسفیان، جیسے سرغنہ موجود تھے جنہوں نے نبی اکرمؐ کی مخالفت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا لیکن قرآن نے ان میں سے کسی کو بھی قابلِ ذکر نہیں سمجھا مگر ابی لہب کا خصوصیت سے نام پکارا ہے۔ ابی لہب قریش کا سردار تھا اور اپنے مذہب کا ۔ م بھی تھا۔ اسی لئے وہ دینِ اسلام کا حقیقی دشمن تھا۔ باقی قریش اس کے تابع تھے۔ اس شخص نے کعبہ کو بتوں کا استھان بنا رکھا تھا۔ یہ بڑا مکار آدمی تھا خزانے میں سے اکثر خرد برد کرتا رہتا تھا۔ نبی اکرمؐ کی دعوتِ توحید میں اسے اپنے منصب کے چھن جانے کا اندیشہ رہتا تھا۔ اور یہ بھی کہ اسلام میں داخل ہو کر دولت کے سرچشمے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ یہ ہوس اسے توحید پرستی سے روک رہا تھا۔

؎ خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں
زبردہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا!

قریش کے تمام رؤسا اس کے قبضے میں تھے گویا ان کی ساری قوتیں اس کی دولت گذار تھیں۔ لیکن مسلمانوں میں سے ایک بھی تو ایسا نہ تھا جو اس کی

ت سے ارادوں میں لچک آجائے۔

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کسطرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

جنگِ بدر میں قریش کے تمام چھوٹے بڑے میدانِ جنگ میں نکل آئے تھے۔ مگر ابی لہب ان دولت کی حفاظت میں باہر نہیں نکلا تھا بلکہ اس نے عاصی بن ہشام سے چار ہزار درم قرضہ میں لیئے تھے چنانچہ عاصی کی جان خرید کر اسے اپنی جگہ میدانِ جنگ میں بھیج دیا تھا۔ ایسا نکما اور بزدل آدمی کعبہ جیسے افضل و مقدس مقام کا سب سے بڑا مالک بنا رہتا؟ ایسے شخص کے بے دست و پا ہو جانے کی پیشگوئی احسان تھا یہ تھا کہ کعبہ کی تولیت ایسے ہاتھوں میں آجائے جو اسے ذاتی اغراض کے حصول کا ذریعہ نہ بنائے۔ اور وہ ہاتھ تھے رسولؐ کے ہاتھ جن کی ذاتِ اطہر کے متعلق علامہ فرماتے ہیں کہ:-

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا!!!

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ!

ابی لہب صرف موت کے ڈر سے اور جان کے بچاؤ کے خیال سے جنگِ بدر میں شریک نہ ہوا۔ لیکن قدرت دیکھئے کہ میدان کے ساتویں روز

اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے چیچک کے عارضہ سے مرگیا اس وقت اس کے دونوں بیٹے موجود تھے لیکن بیماری کے خطرہ کی وجہ سے اس کی لاش تک نہ آئے۔ اور کئی گھنٹوں تک لاش یونہی پڑی رہی آخر لوگوں کی شرم سے لاش کو شہر سے دور لیجا کر پھینک دیا گیا اور دور سے پتھر اکٹھا کر کے پتھروں کے ڈھیر میں چھپا دیا۔ یہ تھا وہ ابی لہب جس نے شکم کے لئے جائز و ناجائز طریقوں سے سامان فراہم کر رکھے تھے۔ ع

دل کی آزادی شہنشاہی۔ شکم سامانِ موت

لیکن کیا آج اس زمانے میں اور اپنی ہی ملت میں ابی لہب موجود نہیں ہیں؟ تلاش کیجئے تو ہر قبیلے میں ملیں گے۔

سُنی طلسمِ کہن میں سپہرِ آدم!!
بغل میں اس کی اب تک بتانِ عہد عتیق

ابی لہب کی موت اور ذلت نے واضح کر دیا کہ تمام سرمایہ جو مرکز سے چھپا کر ذاتی اغراض کے حصول کی خاطر خزانوں میں دفن کر لیا جائے از خود سامانِ موت ہے۔ اور اس بُت کی پرستش سے آزادیِ قلب حاصل نہیں ہوتی۔ اسی حقیقت سے مردِ قلندر نے روشناس کیا ہے، اور فرمایا کہ:

عشق تیاں سے ہے کہ اپنی خودی میں ڈوب جا
نقشِ دوئی کو دہر میں خونِ جگر سے کر تلف!!

ابی لہب کی لاش پکار پکار کر زمانے کو سنا رہی تھی کہ :-

کھول کے کیا بیاں کروں سرِ مقامِ مرگ و عشق!
عشق ہے مرگ با شرف مرگ حیاتِ بے شرف

یہ حال تو اس کا دنیا میں ہوا اور زمانے نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا لیکن قدرت نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ سنیے پہلی فارغ آیات لہب

وہ جھڑکتی ہوئی آگ میں پڑے گا

آدمی جو وہاں سے آتا ہے
اپنے انگار ساتھ لاتا ہے

اس دولت، سرمایہ اور ہوس کو جو انسانیت کے خلاف طریقوں سے حاصل کرنے والی اغراض کے لیے جمع کی جو علامہ نے خس و خاشاک کہا ہے۔ وہ یہ بھی فرما دیا ہے کہ یہ انبار منزل کی راہ میں رکاوٹیں ہیں جب تک نہیں جلا کر راکھ نہ کر دیا جائے۔ راستہ صاف نہیں ہوتا۔ ؎

یہ دہر کہن کیا ہے انبارِ خس و خاشاک!
مشکل ہے گذر اس میں بے نالۂ آتشناک

تیرہ برس کے بعد ۱۳ میں مکہ سے باہر ہجرت کے نظر نے ڈیرے ڈالے دشمنوں نے مشرکین کے لئے خفیہ طور پر آیا اور گرفتار ہو گیا اسے گرفتاری کی حالت میں حضور اکرم کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ ایک مسلمان نے بوسفیان

سے مخاطب ہو کر کہا

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی، اور کافری کیا ہے

اس نے حضورؐ سے کہا کہ یہ گرفتاری میری حاضری کا اک بہانہ بن گئی ہے ورنہ میرے دل میں تھا کہ قریش کی دوستی کے بھیانک جال سے آزاد ہو کر یہاں آجاؤں۔

کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن
خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے

یہ کہہ کر اس نے کلمہ پڑھ لیا۔ اس پر ایک مسلمان نے مسکرا کر کہا۔

گر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

اب ابوسفیان اس قدر ذی عزت اور قابلِ اعتماد تھا کہ اعلان کر دیا گیا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا یا دروازے بند کر لے گا یا ابوسفیان کے گھر پناہ لے گا اسے امن دیدیا جائے گا

"اے پیغمبرِ اسلام۔ آپ اعلان کر دیجئے کہ دیکھو حق ظاہر ہو گیا، اور باطل نابود ہوا۔ اور باطل اسی لئے تھا کہ نابود ہو کر رہے۔"

اس اعلان کے بعد حضور اکرمؐ بغیر جنگ کئے مکہ میں داخل ہو گئے۔ یہ جذبہ

خودی کا ترجمان ہی تو تھا جس نے تمام راستے ہموار کر دیئے۔

خودی سے اس طلسم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

وہی بے کس و بے بس انسان جو ۱۳ سال پہلے اسی مکہ سے ... ت کو جان بچا کر نکلا تھا۔ کسی خبر کی مدد لئے بغیر آج اس جاہ و حشمت سے اسی مکہ میں داخل ہو جو آج تک کسی شہنشاہ کو نصیب نہ ہوئی۔ اللہ کے فرشتوں نے اس "انسان" پر درود بھیجا۔

"بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی کریم پر درود و سلام بھیج رہے ہیں
اے پیروان حضرت ابراہیمؑ (تم بھی اپنے خدا کے ساتھ) ان پر درود و
سلام بھیجو" (۳۳/۵۶)

خدا کے حضور اس شان عجز و نیاز اور انداز گدایانہ سے دلوں کو جھکاتے ہوئے سروں کو باندھے کعبہ کی طرف تشریف لائے۔ کعبہ ایک بہت بڑا بتکدہ بن رہا تھا۔ سب سے پہلے اسے اس آلودگی سے پاک کیا۔ حضرت بلالؓ نے کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دی۔ اس طرح ساڑھے ۱۱ سال بعد اللہ کے گھر سے اللہ کا نام بلند ہوا۔ کعبہ کے اندر جا کر آپ بحضور رب العزت سجدہ ریز ہوئے۔ اس کے بعد لوگوں کو جمع کر کے ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا۔ یہ حکومت الٰہیہ کا پہلا خطبہ سلطنت تھا۔

خدا کے پاک بندوں نے تخیلات کی رعنائیوں سے کام نہیں لیا بلکہ بے دھڑک اللہ کا پیغام عام کیا اور کہہ دیا کہ جہالت کا غرور باطل اور نسب کا افتخار سب خدا نے مٹا دیئے ہیں۔

سیات کیا ہے؟ خیال و نظر کی مجذوبی
خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناں گوں

قابل ہزار حمد و ستائش ہے وہ بارگاہِ صمدیت جس نے اپنے ان وعدوں کو پورا کیا جو اس وقت کئے گئے تھے۔ جبکہ ساری فضا نامساعد اور حالات بالکل ناسازگار تھے۔ چاروں طرف تاریک مایوسیاں تھیں۔ اس نے اپنے بندے کی تائید و نصرت فرمائی اور تمام طاغوتی قوتوں کو کچل کر رکھ دیا۔ لیکن یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ انہوں نے اپنے عمل پیہم سے انسانیت کا مقامِ معراج حاصل کیا اور ساری فضا پر غالب آ گئے۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

طاؤس و رباب آخر

حضور نے خطبہ کے بعد جب مجمع پر نگاہ ڈالی تو سامنے تمام متکبرین قریش کھڑے تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جنہوں نے اس دن دعوتِ حق و صداقت کی

تھی۔ جب حضورؐ نے صفا کی پہاڑی سے اللہ کا نام ان کے سامنے پیش کیا تھا۔ جنہوں نے خاندانِ ہاشم کو تین برس تک ایک پہاڑی کے غار میں محصور کیا تھا۔ وہ معصوم بچوں کی تشنگی کا بھی احساس نہیں کیا تھا جنہوں نے سازش کی تھی کہ شب ہجرت سب مل کر اللہ کے لشکر کو (معاذ اللہ) ختم کر دیا جائے۔ جنہوں نے بدر کے مقام میں اپنی تمام قوتوں کو اس لئے جمع کیا تھا کہ اس مٹھی بھر جماعت کو نیست و نابود کر دیا جائے جنہوں نے اُحد کے میدان میں حضورؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کو شہید کر دیا تھا۔

قتلِ حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ان میں سے وہ بھی ہیں جنہوں نے حضورؐ کو زخمی کر دیا تھا۔ وہ عورت ہندہ بن عتبہ تھی جس نے حضرت حمزہؓ کا کلیجہ نکال کر چبا لیا تھا اور اپنی قومی بربریت اور درندگی کی مثال پیش کی تھی۔ ان انسانوں کو دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ یہ بھی بنی آدم کی اولاد ہیں جس کے حضور فرشتوں نے سجدہ کیا تھا۔

بنی آدم ہے مستانِ کرو بر کا
ہوا یہ خاک سے بے بہرہ کا

نہ خود بیں نے خدا بیں نے جہاں بیں
یہی شاہکار ہے تیرے ہنر کا ؟

کیا اس وقت کوئی قانون اور کوئی طاقت مجرمین کے قتل سے باز رکھ سکتی تھی؟ اس وقت وہ دشمنانِ حق و صداقت مسلمانوں کے رحم و کرم پر تھے حضورؐ نے ان سے پوچھا کہ کیا تم جانتے ہو کہ میں تم سے کیا سلوک کرنے والا ہوں؟ تو ان لوگوں نے وہ جملہ دہرایا جو اس سے پیشتر کئی بار دہرا چکے تھے انہوں نے کہا کہ یہ تو ہم نہیں جانتے البتہ "تو شریف ہے شریف زادہ ہے۔ تیری نگاہوں میں اور سینے میں شرافت ہے"

نبی کی سیرت یہی ہے کہ وہ ہر مقام پر شرافت کا مجسمہ ثابت ہو۔ اس وقت حضورؐ میں انتقام کی پوری پوری قوت موجود تھی۔ سامان موجود تھے۔ موقع ہاتھ میں تھا۔ گنہگار گرفت میں تھے۔ اور پچھلی زندگی آنکھوں کے سامنے تھی لیکن شرافت کے مجسمے نے کہا۔

"آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں۔ جاؤ تم سب آزاد ہو" عرب مسلمانوں کی رگوں میں شرافت کا خون دوڑ گیا۔ اور ایک ایک مسلمان نے ایک ایک قریش کو معاف کر دیا۔ آج انہوں نے محسوس کیا کہ حقیقی معنوں میں وہ فاتح ہیں۔ زمین اور ملک کو فتح کرنے سے فاتح نہیں بنا جاتا جب تک کہ انسانی کمزوریوں پر فتح حاصل نہ کی جائے۔ وہ آج بہت خوش تھے۔ اور یہ خوشی

برسوں کی تکالیف کے بعد میسر ہوئی تھی۔ انہوں نے خوشی کے شادیانے بجائے۔ اور یہ ان کا عملِ ثانی تھا۔ عملِ اول تو شمشیر و سناں رہا ہے۔ ایک مجاہد کے لئے لازم بھی یہی ہے۔ اسی عمل سے وہ اپنی تقدیر کے مالک بنتے ہیں۔

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

کلیدِ کعبہ

دورِ قریش میں عثمان بن طلحہ شیبی ایک شخص تھا کلیدِ کعبہ اسی کے پاس تھی ہجرت کے وقت حضورؐ اس کے پاس آئے اور کہا کہ "ذرا کعبہ کا دروازہ کھول دو۔ تو جانے سے پہلے اس کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو تسکین دے لوں" اس نے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ آپ نے کہا "آج تم میری خاطر دروازہ کھولنے کے لئے تیار نہیں ہو۔ تم مختار ہو۔ لیکن وہ وقت بھی آنے والا ہے کہ میں کلید میں جس کے ہاتھ میں دیدوں گا قیامت تک اس سے کوئی نہ چھین سکے گا" اور یہ کہہ کر آپ خاموشی سے تشریف لے گئے۔ آپ کی پیش گوئی کا ایک ایک لفظ قابلِ غور ہے۔ اس ایک جملہ میں کس قدر قطعی یقین محکم کی جھلک ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ:-

خودی وہ بحر ہے جسکا کوئی کنارا نہیں!
تو آبجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں!
خودی میں ڈوبتے ہیں پھر ابھر بھی آتے ہیں!
مگر یہ حوصلہ مرد ہیچ کارہ نہیں!!

اللہ تعالےٰ کا ایک ایک وعدہ سچا ہو۔ اور اللہ نے اپنے پاک بندے حضور اکرمؐ کے الفاظ کا پورا پورا احترام کیا۔ وہی عثمان آج بے دست و پا سامنے کھڑا تھا اور وہی کلید آنحضرت کے ہاتھ میں تھی۔ آپؐ نے پوچھا اے عثمان تمہیں وہ واقعہ یاد ہے جب ہم اس کلید کو ترس رہے تھے اور وہ تمہارے قبضے میں تھی اور میں نے کہا تھا کہ یہ دن آکر رہے گا۔ عثمان آپ کی گفتگو سن رہا تھا اور پیشانی سے عرقِ انفعال کے قطرے گر رہے تھے اور نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ آج کے دربار میں وہی فقرِ شبم پوش، آنحضرت صلعم پادشاہ تھے۔

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی:
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی
تیری زندگی اسی سے تیری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

حضورؐ کلید کعبہ کو لے کر آگے بڑھے سب کی نگاہیں منتظر تھیں کہ یہ امانت کس امین فقیر کے سپرد کی جاتی ہے۔ حضورؐ اور آگے بڑھے اور وہ کلید اُن

عثمان کے ہاتھ میں دیدی۔ فضل اللہ کبر سے کونج اٹھی۔ یہ تھی نوازش شہنشاہ
و نزاکتِ خسرو۔ اس اندازِ بے نیازی سے عثمان کی آنکھیں کھل گئیں۔

بہ عشق سکھ تا سے "داب خود آگاہی"
ہے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

ایمان و قوت

جب مکہ فتح ہو گیا تو اس کی مرکزیت سے مغلوب ہو کر مختلف قبیلوں کے
وفد پست ہو گئے۔ اب انہوں نے اپنی خوشی سے اسلام قبول کرنا شروع
کیا۔ یہ وہی لوگ تھے جو تک اللہ اور اللہ کے نام کے سخت دشمن تھے
اور آج اسلامی برادری میں شمولیت کا اظہار کرتے چلے آ رہے ہیں۔
یہ بات حیرت کی تھی کہ مسلمانوں کو فتح نہ ہوئی تھی۔ یہ تھا ایمان۔ یہ تھی بے آپ پر
بھروسہ اور اللہ پر توکل۔

خود ہی میر کم سے خدا نے تاش کر غافل
ہیں سب تیرے سوا سب خسارے کار کی رہ

کہ قوت سوال ہے عبادت کا مفہوم کیا ہے بات کی
عبادت ہے تب۔ کہ ہم کی ساتھ پرہیزگار وجود ہیں پھر یہ وجہ ہے کہ
جب تک ہم تباہ حال ہیں۔ حضرت خود تو پر کوئی شے نہ چڑھ آئے گا

اس سے نہ تو سکونِ قلب حاصل ہوتا ہے نہ اطمینانِ دماغ۔ پھر یہ کس لئے ہے؟ اور اگر یہ وقتی دکھوں کا مداوا ہے تو پھر صحیح طریق اور عبادت کیا ہے؟ جسے اختیار کر کے مصائب سے نجات مل سکے۔

یہ سوال تو دو چار باتوں میں ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کا جواب تیرہ سو سال کی پوری تاریخ ہے۔

جب مسلمان نے آخرت سے مفہوم موت کے بعد کی زندگی سمجھا اور دنیا کو فنی اغراض تک محدود رکھا تو اس کی نظر سے دونوں مقام اوجھل ہو گئے اور اسی مقام سے زوال کی منزل شروع ہوئی۔ دراصل دنیا سے مرد فعل حال ہے اور اسے بہتر بنانے سے مقصود یہ ہے کہ اپنی مرکزی قوت و روحانیہ کے تقاضوں کے ماتحت نہایت قوی اور پائیدار بنا جائے اور ہر مسلمان اس مرکز کے دائرہ میں آجائے ——— آخرت سے مراد زمانہ مستقبل ہے کہ اس طرح اور اندازہ کام کئے جائیں کہ مستقبل میں ان کا ثمرہ بہتر سے بہتر ملے اور ہمارے بعد ہماری نسلیں ہمارے مستقبل و دنیا عمدہ حال پا کر سرفرازی کی زندگی میں داخل ہوں اور یہ سلسلہ جاری رہے۔ حتیٰ کہ ہر نسل اپنا مستقبل خوشگوار بنانے کے لئے مستقبل میں آنے والی نسل کے لئے عمدہ حال تیار کرے۔ لیکن ہمارے زوال کی حقیقت نے صلاحین کے عہد میں قوم کو ایسی تاریکی میں لا دیا کہ ہماری قوم دین سے بالکل الگ ہو کر رہ گئی جس کا نتیجہ لازمی طور پر تباہی تھا۔

خودی کی موت ہے غیروں کی نعمت و جاہ

ہر ذی شان ہیں اپنی بزرگوں کی اولاد ہیں جو اس زمین کے وارث تھے۔ یہی عبادت ہے۔ یہی نماز ہے لیکن وہ عروج نہیں ہے جو تدریج سے بدلے ذلت ہے۔

گریں جہاں ہے تو فقط خودی سے ہے ورنہ

گہر میں آب گہر کے سوا کچھ اور نہیں

یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر عزت و نعمت و جاہ کا معیار مسلمانوں کی زندگی درست نہیں ہے تو پھر غیر اسلامی قومیں کس بنا پر عروج پذیر ہیں؟ اس کے جواب میں میں عرض کروں گا کہ ایک بازار کی منڈی کے پاس بے شمار دکانیں ہوتی ہیں اور ان کے مقابلہ میں یہ شریف گھرانے کے پاس بہت تھوڑی دکانیں ہوتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ شریف گھرانہ اللہ کے پاک بندوں کی طرح زندگی بسر کر رہا ہے۔ جب آپ کو آپ ہی کے سوال سے حل ہو جاتا ہے۔ خود فریبی و پیشہ ور کی تہذیب سے حقیقت ہو کر نظر آتی ہے اور لفظ "فریب" بتا رہا ہے کہ یہ ہماری دنیا میں سے دھوکہ ہے۔ نیک ذریعوں سے حاصل کردہ دولت بے شمار نہیں ہو سکتی۔

کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن!
خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے؟

جب بہت سے قبیلے اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے تو قبیلہ ہوازن اور ثقیف کی آتشِ حسد اور عداوت بھڑک اٹھی وہ اسلامی عروج کو برداشت نہ کر سکے چنانچہ انہوں نے جنگ کی ٹھان لی۔ ادھر حضورؐ کو معلوم ہوا۔ تو آپ بھی لشکر کو لے کر آگے بڑھے۔ مکہ اور طائف کے درمیان حنین کی وادی میں دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوا۔ اس سے پہلی جنگوں میں مسلمان تعداد میں کم ہوتے تھے اور ان کے پاس سامانِ جنگ بھی کم ہوتا تھا۔ اس مرتبہ ان کے پاس بارہ ہزار کی مسلح فوج تھی اور ہر قسم کے ہتھیار بھی تھے۔ پہلے کی طرح انہوں نے تائید خداوندی پر بھروسہ نہ کیا بلکہ قوتِ بازو پر اعتماد کیا۔ وہ نہیں گھمنڈ ہو گیا کہ وہ مادی قوتوں کے بل بوتے پر دشمن کو پیس کر رکھ دیں گے۔ یہ غرور اللہ کے قانون کو پسند نہیں ہے کہ انسان اپنے رب کو چھوڑ کر مادہ قوتوں پر اعتماد کر کے آگے بڑھے اور شرک میں پڑ جائے۔

بے ذوقِ نمود زندگی موت
تعمیرِ خودی میں ہے خدائی!

رازِ زورِ خودی سے پربت
پربت شکنِ خودی سے رائی

ہوا کہ پہلی جنگ میں شکست کھانی پڑی۔ ہزار کا لشکر تتر بتر ہو گیا

جاری حرمت سے تیرے دل کی بات ہو رہی تھی دشمن سب کی طرف بھرا ہوا تھا
نہ آسمان ہمارے ساتھ تھے۔ ع

نظر آتیں مجھے تقدیر کی گہرائیاں اس میں!

وہ کیل جس نے بڑے زعم سے للکارا تھا کہ آج ہم پر کوئی غالب نہیں
آج ہم طاقتور ہیں آج ہمیں کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے آج ہم قوت بازو
سے میدان حاصل کریں گے۔ مجھے حیرت و استعجاب ہے اور عقل شدہ حیران
کہ یہ کیا نوبت کا باعث کیا ہے؟ اس وقت دل سے گوشوں سے کہہ۔

ہے یہ ایک درست بات نہیں ہے تجھ میں
گفتار دبر نہ کردار قت سر نہ!...

غافل نہ ہو خودی سے کر اپنی پاسبانی
شاید کسی حرم کا تو بھی ہے آستانہ

زیرِ فلک مقدر ہیں بیشمار کانٹے
مثلِ نگاہ سوزن بیدار بن کے رہنا

ہے یہ سب تیرے جد سب فلسفہ نہ

[illegible]

قدم جم گئے۔ اور لبیک کہہ حضورؐ نے اپنوں اور غیروں کو مخاطب کر کے کہا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اس میں کچھ جھوٹ نہیں۔ اس لئے نہیں ہو سکتا کہ باطل ہم پر غالب آجائے۔ ہم انشاء اللہ باطل پر غالب آئیں گے کہ زمین کی درست ہمارے لئے مقدر ہو چکی ہے۔ میں یہاں خدا کا ٹھہرایا ہوا ہوں۔ اور اس وقت تک ٹھہرا رہوں گا جب تک فتح نہ کر لوں۔ پھر آپ نے مسلمانوں کو واپس بلایا چند لمحوں میں پوری کی پوری فوج دوبارہ اس مرکزِ حق، صداقت کے گرد جمع ہو گئی۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اللہ نے اس واقعہ کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ۔

"(مسلمانوں) یہ واقعہ ہے کہ اللہ بہت سے موقعوں پر تمہاری مدد کر چکا ہے جبکہ تمہیں اپنی قلت و کمزوری سے کامیابی کی امید نہ تھی۔ اور جنگ حنین کے موقعہ پر بھی جبکہ تم اپنی کثرت پر اترا گئے (اور سمجھ لئے کہ محض اپنی کثرت سے میدان مار لو گے) تو دیکھو وہ کثرت تمہارے لئے کچھ کام نہ آئی۔ اور زمین اپنی ساری وسعت پر بھی تمہارے لئے تنگ ہو گئی۔ پھر آخر ایسا ہوا کہ تم میدان کو پیٹھ دکھا کر پھر گئے۔ (۹/۲۵)

ان کے بعد نہایت ہی محکم یقین کے ساتھ اللہ کی امداد کو پکارتے ہوئے آنحضرتؐ نے اپنے لشکر کو حملہ کا حکم دیا۔ مسلمانوں نے اللہ کا نام بلند کرتے ہوئے

حملہ کر دیا۔ اور حملہ کے ساتھ ہی دشمن اس طرح میدان چھوڑ کر بھاگے جیسے وہ پیٹھ سے ہی دور کر چکے ہوں۔ اللہ نے اس فتح کے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ:۔

"پھر اللہ نے اپنے رسولؐ اور مومنوں پر اپنی جانب سے دل کا سکون اور قرار نازل فرمایا۔ اور ایسی فوجیں اتار دیں جو تمہیں نظر نہیں آتی تھیں اور منکرین ان لوگوں کو عذاب دیا جنہوں نے انکار کی راہ اختیار کی تھی اور یہی سزا ہے ان لوگوں کی جو انکار اور کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں اپنی ان کی بدعملی کا لازمی نتیجہ یہی ہے۔"[۳۶]

حنین کی بقیہ شکست خوردہ فوج طائف میں جا کر جمع ہو گئی۔ حضورؐ نے جا کر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ بیس دن تک محاصرہ رہا اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ ان کا زور ٹوٹ گیا ہے۔ تو محاصرہ اٹھا لیا گیا۔

عقل نے تمام قبیلے حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔ عقل نے کثرت و جتھہ غلبہ کا دین کیا اور جھوٹ رہا۔ پھر عقل نے شکست کے بعد حملہ کا تمسخر اڑایا اور فتح مندی کے لئے مسکرا کر جواب دیا۔ اس واقعہ نے ثابت کر دیا کہ جب تک فطرت کی آواز نہیں آتی تو اس کی کامیابی نہیں ہوتی۔

فطرت کو جو یہ سند ہو دیکر ۔ تسخیر مقام رنگ و بو کر
تو اپنی خودی کو کھو چکا ہے ۔ کھوں نہیں شے کی جستجو کر

اعجازِ عشق

اس لڑائی میں بہت زیادہ مقدار میں زر و مال ہاتھ آیا تھا۔ حضورؐ کی حیثیت میرِ ملت کی تھی۔ آپ کو تقسیمِ غنیمت کے کل اختیارات تھے۔ آپ نے تقسیم میں یہ رعایت رکھی قریشِ مکہ میں جو لوگ فتحِ مکہ کے وقت مسلمان ہوئے تھے۔ انکی دلجوئی کی خاطر انہیں زیادہ حصہ دیا گیا۔ اس رعایت سے انصار کے دلوں میں ولولہ پیدا ہوا۔ حضورؐ ایک نگاہ سے ان کے دل کی گہرائیوں کو بھانپ گئے۔ حضورؐ چاہتے تو ایک لفظ سے ان کی زبانیں روک دیتے۔ لیکن اسلام تو مرکزیت کی مطلق اہمیت نہیں دیتا۔ حضورؐ نے انہیں جمع کیا اور خطبہ فرمایا کہ:۔

"اے انصار! یہ سب سچ ہے۔ لیکن کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ یہ اونٹ اور بکریاں لے جائیں۔ اور تم محمدؐ کو اپنے گھر لیجاؤ؟"

یہ سنکر سب کی بے اختیار چیخیں نکل گئیں۔ اور ایک ایک نے نشہِ محبت میں ڈوب کر کہا "یا رسول اللہ! آپ سب کچھ انہیں دے دیجئے۔ ہمیں صرف محمدؐ درکار ہے۔"

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل
اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل

ہو اس طرح کا ان شاہینوں کو ایمان نصیب
کہ ہر مقام سے آگے ہے منزلِ ایمان

[illegible]

[illegible] :-

نظر نہیں تو میرے حلقۂ سخن میں نہ بیٹھ!
کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثالِ تیغ حسیں

اس واقعہ حنین سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہم نظر حقیقت سے کام لیں تو ہر یک واقعہ میں ساری زندگی بٹی ہوئی نظر آنے لگی۔ اللہ کے وہ بندے جنہیں ہر چیز ہرے ہوئے نظر آتی ہے کہ مادی قوتیں ہی سب کچھ نہیں ہوتیں۔ جب تک قلوب میں حقیقت خاطر کا جوہر موجود نہ ہو۔ کسی سلطنت کے قیام یا بقا کے لیے جو قوتیں ضروری ہیں لیکن جب تک سینوں میں ایمان کی لافانی قوت نہ ہو گی جو بڑی سے بڑی بیکار ثابت ہوں گی۔ جرمنی کے فرعون اعظم کی بے پناہ طاقتوں کی شکست فاش نے فطرت کی اس حقیقت پر مہر ثبت کر دی ہے۔ ایمان و قوت کے ساتھ قربانی کا جوہر بھی بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ قربانی ایثار کا نام ہے اور ایثار میں ایثار مال و جان دونوں شامل ہیں۔ کیونکہ ہر کس کے نزدیک جو چیز عزیز ہو سکتی ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ جذبہ کہ تنہا حفاظت [illegible] سے [illegible] اس جنگ میں [illegible] بغیر واپس ہونا غضب ہے۔ یہ [illegible] کر دیں تو [illegible] مسلمان [illegible]۔

غائب و حاضر [illegible] مسلمان حرم

[illegible]

اسیرِ گردش

مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی قوت دیکھ کر رومی حکومت کو خیال ہوا کہ اس سیلاب کو پہلے ہی سے روک دینا چاہیئے۔ چنانچہ اپنے ماتحت شام کی حکومت کو اس کے لئے متعین کیا۔ اور بہت بڑے پیمانے پر جنگ کی تیاریاں شروع ہوئیں یہ واقعہ غزوہ تبوک کے نام سے مشہور ہے۔ جو ۹ھ میں ہوا۔

ادھر مسلمانوں کا یہ عالم تھا کہ غریبی کے علاوہ قحط کا دور بھی گذر رہا تھا لیکن صحابہ کرامؓ اور سچے مسلمانوں نے حسبِ توفیق سب کچھ جنگ کے لئے پیش کر دیا مگر ان مسلمانوں میں کچھ منافق لوگ بھی تھے۔ وہ اس جنگ سے کترانے لگے۔ کچھ جنگ میں شامل ہی نہ ہوئے اور کچھ میدان سے واپس چلے آئے۔ ان کی زبان پر گردش شام و سحر کی شکایتیں تھیں یہ کہہ رہے تھے کہ ہم اچھے مسلمان ہوئے کہ زندگی جنگوں میں گذر رہی ہے۔

ایسے نازک وقت میں جبکہ ساری ملت کی موت و حیات کا سوال درپیش ہو۔ وہی پیچھے رہنے کی اجازت مانگ سکتا ہے جس کے ایمان میں خلل ہو۔

"اے پیغمبر! سلام تجھ سے اجازت طلب کرنے والے تو وہی ہیں جو فی الحقیقت اللہ اور آخرت کے دن پر یقین نہیں رکھتے۔ اور ان کے دل شک میں پڑ گئے ہیں۔ اور اپنے شک کی حالت میں متردد ہو رہے

ہیں ۔ ۵ ۹/۴۵

حضرت علامہ نے اس کی تفسیر یوں فرمادی ہے۔

اس کی خودی ہے ابھی شام و سحر میں اسیر
گردشِ دوراں کا ہے جس کی زباں پر گلہ !

حکمتِ شاہ یحییٰ

یہ ٹھیک ہے کہ بعض صورتیں معذوری کی بھی ہوتی ہیں۔ ایسی حالت میں کسی پر لزوم نہیں لگایا جاتا۔ اللہ نے فرمایا ہے کہ:۔

"ناتوانوں پر، بیماروں پر، اور ایسے لوگوں پر جنہیں خرچ کے لئے کچھ میسر نہیں، کچھ گناہ نہیں اگر وہ دفاع میں شریک نہ ہوں بشرطیکہ اللہ اور اس کے رسول کی خیر خواہی میں کوشاں رہیں کیونکہ ایسے لوگ نیک عملی کے راستے سے باہر نہیں ہوتے اور نیک عملوں پر لزوم کی کوئی وجہ نہیں۔ اللہ بڑی بخشش والا ہے اور رحمت والا ہے" ۹/۹۱

لیکن ایسے لوگ جو صحت سے دفاع میں شرکت کے قابل ہوں اور پھر بھی نہ شریک ہوں تو صحت معاف نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:۔

"اے نبی سلام ان لوگوں پر ہے جو بہانے بنا کر بیٹھے رہنے کی اجازت مانگتے ہیں حالانکہ وہ ان لوگوں سے پسند کیا گیا جب سب لوگ اٹھ

ہیں کوچ کر رہے ہوں تو یہ گھروں میں رہ جانے والی عورتوں کے ساتھ
رہیں اللہ نے انکے دلوں پر مہر لگا دی پس یہ سمجھتے بوجھتے نہیں" (۹/۹۳)
اللہ کے آخری جملے کے ٹکڑے (سمجھتے بوجھتے نہیں) کا مفہوم یہ ہے کہ
یہ لوگ ہی حقیقت پر ایمان و یقین نہیں رکھتے کہ زندگی اور موت پر صرف اللہ
کو قدرت حاصل ہے وہ چاہے تو حضرت ابراہیم کو نمرود کی آگ میں سلامت رکھے
اور چاہے تو آرام سے بیٹھے بٹھائے کی روح قبض کر لے۔ پھر یہ بھی نہیں سمجھتے
کہ پیغمبر اسلام کا عمل ہی زندگی کا مقصود ہے اور یہی معراجِ انسانیت ہے۔ اور یہ
بھی نہیں سمجھتے کہ اسی بلندیِ شرافت سے کبریائی حاصل ہوتی ہے اور اپنی
اسی بلندی سے انسان ساری فضا پر کمند ڈال کر اسے تسخیر کر لیتا ہے حضرت علامہ
نے اس حقیقتِ کبریٰ کو ایک شعر میں بیان فرما دیا ہے۔

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش!
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

کمال کمال

جس کی تعبیر یہ ہے کہ ہم جب اس کی زندگی پر [illegible]

کا سامان تیار کرتے رہیں اور جب جہاد میں ہوں تو امنِ عالم کے لئے لڑتے رہیں
اور اس وقت تک لڑتے رہیں جب تک لڑائی کا فیصلہ ہمارے حق میں نہ ہو جائے
ایسے مجاہدین کے لئے اللہ نے حال ماضی اور مستقبل میں نعمتوں کا وعدہ کیا ہے۔

"اور مہاجرین و انصار میں سے جو لوگ سبقت کرنے والے سب
سے پہلے ایمان لانے والے ہیں، اور وہ لوگ جنہوں نے راست بازی
کے ساتھ ان کی پیروی کی تو اللہ ان سے خوشنود ہو، وہ اللہ سے
خوشنود ہوئے۔ اور اللہ نے ان کے لئے باغ تیار کئے جن کے
نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ اور اس لئے وہ ہمیشہ ہونے والے ہیں،
وہ ہمیشہ اس نعمت کی زندگی میں رہیں گے۔ اور یہ سب بڑی
نعمت ہے۔" (۹/۱۰۰)

اسلام نے یہ بھی تعلیم دی ہے کہ اپنے مرکز میں رہ کر مرکز سے بیرونی
حالات کا جائزہ لیتے رہیں۔ لیکن بیرونی حالات کے ساتھ مذہب کو ہمیشہ ہم آہنگ
کریں۔ اور مرکزیت کی قوت سے خارجی اور داخلی چیزوں پر غالب آ جائیں۔

ذوق کے نشہ سے دنیا پہ چھا جا
مقام نک دیکھ کا راز پا جا

پرنگ بجز سے تل آشنا رہ
کشا سے تل شدہ من تنگ جا

آخر زمانی

ہمارے دور کا مسلمان زوالِ امت کے اسباب پوچھتا ہے اور نہیں سمجھتا کہ اسباب کیا ہیں؟ ان میں سے کثرت کے ساتھ ایسے ہیں جنکا فیصلہ ہے کہ زوال صرف غریبی اور افلاس سے آیا ہے۔ نہیں یہ معلوم نہیں کہ جنگِ تبوک میں مسلمانوں کے پاس سواری کا انتظام بھی نہیں تھا اور وہ اس افلاس کے ساتھ میدان میں کود پڑے تھے اور مقابل کے بے شمار سامان پر غالب آ گئے تھے ان لوگوں سے اگر کہا جائے کہ اٹھو خدا کی راہ میں قدم اٹھاؤ۔ اپنا مقام پہچانو۔ تو جواب دیتے ہیں کہ یہ عزت اور ذلت سب خدا کی طرف سے ہے اگر ہماری تقدیر میں ذلت ہے تو اسوقت تک ذلیل رہے گی جب تک خدا اسے ختم نہ کر دے۔ لیکن اقبالؒ فرماتے ہیں کہ:

تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں بنتے

وہ یہ کہتے ہیں کہ تقدیر بدلنے والا تو امام مہدی ہے جب تک ان کا ظہور نہیں ہوتا ذلت ہی تب بھی نامکمل ہے وہ آخر زمانی آئے گا اور ایسا چھوٹا منظر پڑے گا کہ باطل کی جنگاریاں اڑتی نظر آئیں گی کفر مغلوب ہو جائے گا۔ اور پھر اس کے بعد کیوں حرکت میں آئیں؟ لیکن اقبالؒ کہتے ہیں کہ یہ وہ مسلمہ جو پہلے مومن کی جنات سے کرتے ہیں آج تک وہی آخر زمانی ہے۔

کھلے جاتے ہیں سرِ رہنمائی
کہ یہ دورِ مدیتِ الترانی!

ہوں جس کی خودی پہلے نمودار
وہی مہدی وہی آخر زمانی۔

وفاشعاری

مرزا دوستی کے نام ملت سے وفاشعاری کرنا ہے جبکہ ہوں کیا
کچھ آخروں میں رہ گئے تھے ان میں سے ایک کعب بن مالک بھی تھے۔ لیکن
یہ دستور نہیں رہے تھے بلکہ ان سے سستی واقع ہوئی تھی۔ جب آنحضرت فتح
مکہ سے واپس تشریف لائے تو ان منافقین کا معاملہ پیش ہوا۔ کچھ لوگوں نے عذر
پیش کئے اور معافی بھی مانگ لی۔ دوسرے کعب سے بھی کہا گیا تو انہوں نے عرض کیا
کہ میں سچا ہوں رسول اللہ سے عذر پیش کرنے کا کام نہیں لے سکتا چنانچہ
جب سے بات کرنے کی اجازت دی تو حضور نے فرمایا کہ خدا کے حکم کا انتظار کرو
دوسرے تمام لوگوں کو حکم دیا کہ ان سے سخت بائیکاٹ کر دیا جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا
پچاس دن یہ سزا کی سزا کرنے کے بعد ملک غسان کا خط آیا کہ دیا جس میں لکھا تھا کہ تمہارے
آقا نے تمہارا بائیکاٹ کر دیا ہے تو تم ہمارے پاس چلے آؤ یہاں تمہارے لئے
عزت سے سامان موجود ہے۔ آپ غور کیجئے کہ جب سے پاس ان کے کیا

جواب تھا، کعب کی مشکلات کا تقاضہ تھا کہ وہ اُسی وقت عزت کی جگہ پہنچ جاتا لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا۔ اُس نے وہ خط اُسی قاصد کے سامنے جلا دیا اور کہا کہ اپنے آقا سے جا کر کہہ دینا کہ مجھے میرے آقا کی ناراضگی مبارک ہے ایسا آقا جس کا خود خدا لحاظ کرتا ہے۔ ——— اور آج کیا ہو رہا ہے؟ آپ کو معلوم ہوگا کہ فیصلہ پاکستان کے بعد گنتی کے چند مسلمانوں نے حضرت قائدِ اعظم رحمہ کے ساتھ ہجرت کا فیصلہ کیا تھا۔ باقی سب نے فقرے کسے اور مذاق اُڑایا تھا اور یہاں تک کہا تھا کہ اس بڈھے کے حواس ٹھیک نہیں ہیں۔ یہ پاکستان کا خواب دیکھ رہا ہے پاکستان چار دن کا کھیل ہے۔ اِس قسم کی باتیں کی گئیں۔ اور وہ لوگ ہندو کے دشمن تھام کر وہیں رہ گئے۔ بعد میں اِس انکار کا نتیجہ بھگتنا پڑا۔ اور چند ہی دنوں کے بعد جب اُن پر مظالم ٹوٹنے لگے اور گھر بار چھوڑ دیئے گئے تو چار و ناچار اُسی زمین کی طرف رُخ کیا ہے جسے وہ مجذوب کی بڑ سمجھتے تھے۔ پھر ایک گروہ ایسا بھی رہ گیا جو ظالم کے سامنے میں جینا عین حیات سمجھتا تھا۔ لیکن اڑھائی برس کے بعد مارچ ۱۹۵۰ء میں جب مسلمان کا قتلِ عام شروع ہوا۔ تو پھر وہ لوگ جان بچانے کے لئے پاکستان کی طرف بھاگے۔ کیا انہیں اپنا کیا سزا ملتی ہے؟ کیا یہ لوگ ان میں سے نہیں ہیں جنہوں نے غداری کی اور اقتیاز کی بھی؟ کیا ہند کو امن کی ضمانت دینے والے یہ لوگ جو ہم سے ملک چھوڑ کر واپس دشمن کی پناہ میں نہیں چلے جائیں گے؟ [illegible] جو ہم سے [illegible]۔ تو کیا انہیں یہ کہا جائے کہ ہماری ملت میں سے [illegible] ہندوستان

بسا ہے ہیں، اور ایک مرکز کے ماتحت ہیں، افسوس کہ ابھی وہ شے جو شرف انسانیت سے آگاہ کرتی ہے ان کے سامنے عریاں طور پر نہیں آئی۔

جوہرِ زندگی ہے عشق۔ جوہرِ عشق ہے خودی
آہ کہ ہے یہ تیغ تیز پردگیِ نیام میں!

یہ کہتے ہیں کہ ہمارا سب کچھ ہند میں رہ گیا ہے۔ انہیں اینٹ پتھر سے مکانات عزیز ہیں۔ نہیں وہ زمین محبوب ہے جس پر یہ سر جھکا کر چلیں، دوسرا اٹھا کر چلنے کی اجازت نہیں ان کا عذر ہے کہ پاکستان میں آکر غریب ہو جائیں گے۔

کبھی ناسامانیِ خودی کی
کبھی رمزِ پنہانیِ خودی کی
تجھے گر فقر و ذلت ہی کا بتا دوں!
غریبی میں نگہبانیِ خودی کی!!

یہ ان بتوں کی یاد میں آنسو بہا رہے ہیں جن کی قیمت چند روپے ہے یہ اس بت کو بھول رہے ہیں جسے ہر وقت ہند و لوٹ رہا ہے اور انہیں واقف نہ خدا دان ہیں اور کیا بنکر جیتے ہیں۔

خودی کے سازِ میں ہے عزت جاوداں کا سراغ
خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ

یہ چار کروڑ مسلمان قیمت کے بارے ہمارے بھائی ہیں اور ہندو کے

رحم و کرم پر سانس لے رہے ہیں۔ وہ جب چاہے ان کی آبرو چھین لے یہ وہ مسلمان ہیں جن کے متعلق زمانے کا فیصلہ ہے کہ ۔

؎ یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

اور جس کے لئے حکم ہے کہ :۔ ؎

فروغِ محمود سے در گذر
خودی کو نگہ رکھ بازی نہ کر

تیری آگ اس خاکداں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں

علمِ اقبال

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۔ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۔ ۲۹/۶۴

زندگی محض کھیل کود کی زندگی ہے بچپن کا زمانہ ہے۔ زندگی تو موت اس کے بعد کی منزل ہے۔

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ بتایا جائے کہ زندگی بجائے خود ایک شے کا نام ہے غیر منقطع جہاں کوئی شے رک جائے وہ اس کی موت ہوتی ہے۔ ؎

زندگانی از خرامِ پیہم است　　برگ و سازِ ہستی او پیہم است

موجودہ دورِ حیات کے بعد دوسرے دور کے شروع ہونے کے متعلق ارشاد ہے۔ ؎

این نائب در خانۂ ما　　فلک یک گردشِ پیمانۂ ما

ہیئتِ سوز و سازِ ما ازاست　　جہاں دیبہ چہ افسانۂ ما

ذرا اس نائب در خانہ اور گردش یک پیمانہ کے معنوں کو دیکھئے اور ہمیں سمجھائیے۔ آیت مذکورہ کے اس حصہ کو کہ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۔ اور اس دیباچہ افسانۂ ما کے ساتھ ملا کر پڑھئے۔ یہی حیوان کو یہ موجودہ زندگی کا نقش دیباچہ سمجھ کر اس کا ذکر کرنے پر مجبور کرنے والی ہے۔

ہر چند مضمون طویل ہو جاتا ہے لیکن بغیر نہیں چاہتا کہ کچھ چیزیں

آجائے اور اسے یونہی چھوڑ کر آگے گذر جائیں ۔ حدیثِ سوز و سازِ رازِ
است ، کے لئے مجھے نظریۂ ارتقا بیان کرنا چاہئے ۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے
عرض کر چکا ہوں یہ ایک الگ موضوع ہے ۔ جس کا ضمناً لکھنا دشوار ہے ۔
یہاں صرف حضرت علامہ کے اس مصرع کے متعلق کچھ اشارات ضروری ہیں
قرآن کریم میں ارتقا کے ضمن میں یہ بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالےٰ ایک تدبیر
—— کرتا ہے ۔ پھر اس تدبیر کو پختگی کی حد تک پہونچانے کے لئے اسے
مختلف مراحل طے کراتا ہے ۔ قطرہ کو گہر ہونے تک گوناگوں مقامات
سے گذرنا ہے ۔ ایک ایک مقام اور ایک ایک منزل کا نام یوم ہے (بمعنی
دن) لیکن یہ ایام ہمارے گردشِ لیل و نہار کے ایام نہیں ۔ بلکہ ان کا
طول ہمارے حساب سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے ۔

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ ۔ ثُمَّ يَعْرُجُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ
كَانَ مِقْدَارُهُ أَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّونَ ۳۲/۵

وہ آسمان سے زمین کی طرف تدبیر امور کرتا ہے پھر وہ امر بتدریج ترقی کرتے ہوئے
اوپر بلند ہوتا ہے ۔ ایک دن میں جس کی مقدار انسانوں کے اعداد و شمار کے لحاظ
سے ہزار سال ہو سکتی ہے ۔

دوسری جگہ ہے کہ بعض ایام پچاس ہزار سال کے بھی ہوتے ہیں ۔ اسی گردش
کو دیکھئے ۔ اپنی اصل سے الگ ہونے کے بعد (جس کا ذکر قرآن کریم میں موجود
ہے) کتنے عرصہ دراز میں اس قابل ہوئی ہوگی ۔ کہ اس پر کوئی ذی روح آباد
ہو سکے اسی طرح انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے منازل

سے کرنی ہوگی۔ اور اس میں کتنا وقت صرف ہوگا۔ اب پھر دیکھئے کہ

حدیثِ سوز و سازِ ما در ادا است

کس قدر سچی حقیقت ہے۔ اور کس قدر لطیف پیرایہ میں بیان کی گئی ہے۔ اسی کو دوسری جگہ ذرا زیادہ شوخی سے لکھتے ہیں کہ

مالِ خبشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں کار جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

ہاں۔ تو کہنا یہ تھا کہ موت زندگی کو ختم کرنے والی شے نہیں۔ بلکہ یہ تو ایک نئی زندگی کا دروازہ ہے۔

چشم کشائے اگر چشم تو صاحب نظر است زندگی در پئے تعمیرِ جہانِ دگر است

اسی عنوان پر دو ایک شعر اور بھی دیکھتے جائیے۔ کبھی شعروں کو دیکھئے اور کبھی اپنے قلب و دماغ کو کہ ایک ہی تانیہ میں ان اشعار نے انہیں علم و ادراک کی کن بلندیوں اور کیف و نشاط کی کن جنتوں میں پہونچا دیا۔ ایسے ایسے شعر کہہ دینا در حقیقت فیضان ہے۔ اس کتابِ مبین کی ضیا پاشیوں کا جس کا دعوے ہے کہ آؤ۔ تمام لوگ سارے مل کر اس کی ایک سورت کی مثل کوئی چیز پیش کر کے دکھاؤ۔ جیسے شجرِ طیبہ سے برگ و بار بھی ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے فرماتے ہیں ؎

تاکِ ما خیز و کہ سازد آسمانے دیگرے ذرۂ ناچیز و تعمیرِ جہانے دیگر

پیامِ فرنگ کے دو شعر ہیں ؎

زندگی جوئے روان ست و روان خواہد بود این ہمے گفتہ چو ان ناسفتہ چو ان خواہد بود

شعلہ بودیم و گشتیم و شرر کردیم صاحبِ ذوقِ تپش و نظر کردیم

اس آخری شعر کو ملاحظہ فرمائیے۔ شعلہ کی شکست اس لئے نہیں ہوتی کہ وہ ناکستنی کر دیا جائے۔ بلکہ اس لئے کہ اس میں پہلے سے بھی زیادہ تڑپ، چمک، حرارت پیدا ہو جائے۔ انسانی ہیولیٰ میں ہر چند "نورانیت" کا عنصر موجود ہے، لیکن ابھی "مادیت" کا عنصر زیادہ غالب ہے اس لئے خاکی اشیاء پر ظلمتوں کے پردے پڑے رہتے ہیں۔ اس ہیولیٰ کی شکستگی اس لئے ہوگی۔ کہ اس کے بعد شعلہ کی حرارتیں سمٹ کر شرر بن جائیں اور وہ اس آتشدانِ خاکی سے اڑ کر فضائے نور کی ان وسعتوں میں جا پہنچے جن کے لئے لاشرقیہ ولاغربیہ آیا ہے۔ جو مکانیت کے موجودہ تصورات کے دائرہ سے باہر ہیں۔ یعنی ادھر سکرتِ موت کی تلخی آنکھ بند کرے اور ادھر نورانی ملائکہ استقبال کے لئے آجائیں کہ حضور آیئے۔ تشریف لائیے۔ دیدہ و دل فرشِ راہ ہیں۔ یہ نورانی دربان یہ دل دنیا کو سکون و اطمینان کی مژدگی پہنچانے والی حسین ہستیاں آپ کے انتظار میں ہیں۔

اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ طَیِّبِیْنَ۔ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْکُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّۃَ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ملائکہ نہایت آسودگی کی حالت میں وفات دیتے ہیں، کہتے ہوئے کہ تم پر سلامتی و رحمت ہو۔ آیئے جنت میں داخل ہو جائیے۔ بدلہ ان اعمال کے جو تم نے کئے ہیں۔

اس آیت کو سامنے رکھئے اور پھر اس شعر کو پڑھئے کہ

شعارِ ودیگر و شکستیم و شرر گردیدیم صاحبِ ذوق و تمنا و نظر گردیدیم

پھر جنت کے متعلق جو اس آیت میں۔ اور دیگر متعدد آیات میں، آیا ہے کہ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ یعنی جنت اعمال کی جزا ہے اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ

آن بہشتے کہ خدائے بخشد ہمہ ہیچ تا جزائے عمل تست جناں ہیچ ہست

زندگی کے تسلسل کے متعلق غزل کا بھی ایک شعر سنئے۔ اور دیکھئے غزل کی رنگینی باقی رکھتے ہوئے بھی حقائق کیسے بیان کئے جا سکتے ہیں، فرماتے ہیں

پریشاں ہو گئے میری خاک آخر دانہ بنجائے جو اب مشکل ہر یار بھی پھر وہی مشکل نہ بنجائے

قیامت کے متعلق قرآن کریم میں ہے۔ کہ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ، جب نفوس کو (جسموں سے) اٹھایا جائے گا۔ یا ملایا جائے گا۔ خاک اپنی پریشانی کے بعد پھر سے "دال" بن جائے گی۔ اس غزل کا دوسرا شعر ہے۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بنجائے

اس شعر میں انسان (آدم) کے ہبوط و صعود کی حقیقت کس قدر دلآویز پیرایہ میں بیان کی گئی ہے تخلیق آدم کا قصہ ہم اوپر دہرا آئے ہیں۔ اس کے بعد ہبوطِ آدم کا ذکر ہے۔ ہبوط کے معنی نیچے گرنے کے ہیں، آدم کے جنت سے نکلنے کے لئے قرآن کریم نے تزویج (نکاح) کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ ہبوط (نیچے گرنے) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس ہبوط کی وجہ سے آدم کو جو ٹوٹا ہوا تارہ کہا اس قدر موزوں ہے۔ کہ تارہ جب ٹوٹتا ہے تو نیچے گرتا ہے۔ پھر حضرت آدم نے اپنے ہبوط کا جو اثر بیان کیا تھا وہ یہ تھا کہ "بارِ امانت" کی ذمہ داری تو بہ قبول نہ ہوئی۔ ہم نے اپنی

حالت میں نہ پہنچایا گیا تو لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۔ ہم نقصان اٹھانیوالوں میں سے ہو جائیں گے ۔ لوٹا پانے والوں میں سے ہو جائیں گے ۔ اس ہبوط کے ان تمام ارتقائی منازل کو طے کر کے پھر ایسا عروج حاصل کرنا کہ تارہ مہ کامل بن جائے ۔ اسکی عظمتیں اور رفعتیں پہلے سے بھی زیادہ بڑھ جائیں ۔ یہ ہے وہ راز جو ملائکہ کی نگاہوں سے اوجھل تھا ۔ اور جس کی وجہ سے یہ انجم یوں سہمے جاتے ہیں ۔ قرآن کریم میں ہے

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۔ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۔ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ (والتین)

بے شک ہم نے انسان کو بہترین ہیئت میں پیدا کیا ۔ پھر اسے (اس کے اعمال کی بدولت) نچلے سے نچلے درجہ میں لوٹا دیا ۔ مگر سوائے ان کے جنہوں نے ایمان کے ساتھ اعمال صالح کئے ۔ پس ان کے لئے غیر منقطع اجر ہے ۔

انسان میں ایمان و عمل صالح پیدا ہوتے دیکھئے پھر دیکھئے کہ یہ شہباز کن بلندیوں پر اڑتا ہے ایسی فضاؤں میں جو حد نہ آشنا ہیں (غیر ممنون) اسی پرواز کی پہلی منزل ہے جس کے متعلق فرماتے ہیں ۔

برخیز کہ آدم را ہنگام نمود آمد این مشت غبارے را انجم بسجود آمد

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ۔ یہی فرق ہے یورپ کے نظریۂ عروج اور ایک مسلم کے نظریۂ عروج میں ۔ یورپ کا دہریت انسان کی پرواز اس دنیا یا زمانہ سے زیادہ کسی قریبی ستارے مثلاً مریخ وغیرہ

تک بہت ہے۔ اور وہ بھی محض جسمانی پرواز۔ جو پرندوں کی پرواز ہی ہے اور
کی زندگی سے متعلق ہے لیکن قرآن کریم انسان کو بہت اونچا لے جاتا ہے۔
كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ایسے مبارک درخت
کی طرح جس کی جڑیں مضبوط ہوں اور جس کی شاخیں آسمان کے اوپر ہوں
اسلئے حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ من — قدم اٹھا یہ مقام اے تہلئے راہ نہیں

اس چیز کو دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں — یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا — کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

اس تخیلی مناظر کو "عشق کے امتحاں" کہا خشک فلسفہ کو کس قدر شیریں بنا
دیا ہے۔ دوسرے شعر میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ کہ یہ بلندیوں
کی فضائیں جنہیں قرآنی اصطلاح میں سموات کہا جاتا ہے۔ آبادی سے خالی
نہیں۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيهِمَا مِنْ دَابَّةٍ۔ ۴۲/۲۹

اللہ کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے زمین و آسمان پیدا کئے اور بلندیوں
میں پیدا کیا۔ دونوں جہانوں میں جو جاندار پھیلا رکھے ہیں۔

اس شعر کے دوسرے مصرع میں ان آباد فضاؤں کو کارواں کہا گیا ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَائِقَ ۔ اور ہم نے تمہارے اوپر سات (یا متعدد) رہگذر بنائے یہ رہگذر کاروانوں ہی کے لئے تو ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کارواں در کارواں ہجوم کون کون سی ارتفاعی منازل طے کرتے پھر رہے ہیں۔ عشق کی کون کون سی وادیوں میں سرگرداں ہیں۔ پھر چونکہ یہ تمام آبادیاں ایک جوئے رواں کی طرح ہر وقت مصروفِ خرام ہیں، قطع منازل کر رہی ہیں۔ اس لئے ان کو کارواں کہنا ایسا حسین انداز ہے جس کی داد غالب ہی دے سکتا تھا

شعر جذبات کے اظہار کا بہترین ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ انہی جذبات سے اس میں دلکشی اور سوز و گداز پیدا ہوتا ہے لیکن جب شعر میں حقائق بیان کئے جائیں یا اس کا انداز معمولی نہ۔ اور پیامی ہو جائے تو پھر اس میں بالعموم شعریت باقی نہیں رہتی۔ پھر یا تو وہ شعر اس انداز کا ہو جاتا ہے کہ ؎

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات ہنس کر گذار یا اسے رو کر گذار دے

یا اس انداز کا۔

تو بھلا ہے تو برا ہو نہیں سکتا اے ذوق ہے برا وہی کہ جو تجھ کو برا جانتا ہے
اور اگر تو ہی برا ہے تو وہی کہتا ہے کیوں برا کہنے سے تو اسے برا مانتا ہے

اور ایک ذوق ہی پر کیا موقوف ہے۔ بڑے بڑے عمدہ شعر کہنے والے جب بیان حقائق یا معمولی انداز میں کچھ کہتے ہیں۔ تو شعر بے جان ہو جاتا ہے

جن پر خصوصیت صرف علامہ ہی کے حصہ میں آئی ہے۔ کہ حقائق اور حقائق
بھی اس درجہ دقیق جن کے جاننے والے اور شعر کے حسن میں بھی کوئی کمی
نہیں آتی۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔

ستاروں کی دنیا کے متعلق زبور عجم میں فرماتے ہیں۔

مدار مرکز جیب خاکدان نشیمن ماست کہ ہر ستارہ جہان است و یا جہان بود است

یہ اقبال کی ایک مسلسل خرام کا نام ہے۔ چلتے جانا۔ بڑھتے جانا۔ اور بڑھتے
جانا۔ بڑھتے ہی چلے جانا۔ کہ ؎

ہر ایک مقام سے آگے مقام ہے تیرا حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

جسے مقام سمجھا جاتا ہے وہ مقام نہیں۔ جسے منزل کہا جاتا ہے وہ منزل
نہیں۔ راہی ذرا سستانے دم لینے کے لئے۔ گھنے درختوں کا سایہ ہے
دن کے دوپہر کاٹنے کے لئے نخلستان ہے۔ وہ جنت کہ جسے بالعموم
منزل مقصود سمجھا جاتا ہے۔ راستہ کی خوشگوار وادی ہے کہ جنت میں
پہونچنے والے بھی جنت کی یہ کیفیت ہوگی کہ۔

يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ۔

ان کا نور ان کے آگے۔ دائیں کے دائیں کی طرف جا رہا ہوگا۔

یہ فراخدلی کی روشنی۔ یہ سرچشمہ امید۔ بالآخر کی منزل کا راستہ دکھانے
سے بھی نہ چوکی۔ اور راستہ جس کے متعلق ارشاد ہے۔ کہ جنت میں
پہونچنے کی دعا رَبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ ان کی ایک پسندیدہ راستہ

کی طرف رہنمائی کی جائے گی ۲۳/۲۴ دنیا میں صراطِ مستقیم پر چلنے کی دعا تھی۔ ایک سیدھے راستہ پر چلنے کی۔ وہاں ایک پسندیدہ راستہ پر چلائے جائیں گے۔ اس لئے جنت مقام نہیں۔ راہ گزر ہے۔ وہاں سے بھی انسان کو آگے بڑھ جانا ہے۔

اگر عنان تو جبریل و حور می گیرند　　کرشمہ بر دل شاں ریز و دلبرانہ گذر

کہ ملائکہ کا تو یہ ہیرا مسجود۔ اُن کا مقام اس کا مقام کس طرح ہو سکتا ہے۔ یہ تو وہ "شکار" ہے جس کا اٹھانا بھی تضیعِ اوقات ہے

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے　　یزداں بکمند آور۔ اے ہمتِ مردانہ

لیکن بایں ہمہ۔ انسان "لامکان" نہیں　　ہر ایک مقام سے آگے ہی سہی۔ لیکن مقام اس کا ضرور ہے۔ وہ مقام کیا ہے؟ وہ منزلِ مقصود کونسی ہے؟ یہ راز ہے جسے کھول کر بیان نہیں کیا گیا۔ نہ ہی اس کی آج ضرورت تھی۔ آج تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی کے بعد اگلی منزل کونسی ہے؟ سو اس کی تفصیل شرح و بسط سے قرآن کریم میں موجود ہے اس منتہیٰ کے متعلق تو سرِ دست اتنا ہی کہا گیا ہے کہ وَاِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی اس کا منتہیٰ تیرے رب تک ہے۔

شعلہ در گیرد و برخس، در خاشاکِ من　　مرشدِ رومی کہ گفت۔ منزلِ ما کبریاست

لیکن یہاں پہونچکر حضرت علامہ واصل باحق سے عقیدہ کا اتباع نہیں کرتے اور قرآن کریم کے رو سے انسان کے خدائے واحد کی ذات میں جذب ہو جانے کے عقیدہ کی سند نہیں ملتی۔ لیکن حضرت علامہ اس عقیدہ کے

خلاف میں بھی ایک شانِ انفرادیت پیدا کر لیتے ہیں۔ اور اسے انسان کی خودی
مکم بالذات ہونے کے منافی سمجھتے ہیں، کہ وہ کسی کی ذات میں گم ہو جائے۔
خواہ وہ خدا ہی کی ذات کیوں نہ ہو۔ ان کے نزدیک عشق قطرہ دریا
میں فنا ہو جانا نہیں۔ بلکہ تہ دریا گہر بن کر بیٹھ جانا ہے۔ آپ فرماتے ہیں

چناں با ذاتِ حق خلوت گزینی ترا او بیند و او را تو بینی
بخود محکم گذار اندر حضورش مشو ناپید اندر بحر نورش

"تو او بیند" تو ہر وقت کا معاملہ ہے۔ وہ کون سا لمحہ ہے جب خدا انسان کو
نہیں دیکھتا۔ لیکن "او را تو بینی" کا مقام اس منزل سے آگے آتا ہے۔ موجودہ
مقام میں تو ایک اولوالعزم پیغمبر نے جب یہ آرزو کی، کہ رب ارنی۔ تو
جواب مل گیا کہ لن ترانی (تو مجھے نہیں دیکھ سکتا) لیکن اس سے اگلی منزل
میں مومنین کی یہ کیفیت ہو گی کہ

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ۔

بہت سے چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے۔ جو رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے
یہ صدا بندے کو دیکھ رہا ہے۔ اس وقت بندہ بھی خدا کو دیکھے گا کہ

حبہ و مول و کمین یک دگر ہر دو محتاب اند از ذوق نظر
زندگی بر باکہ باشد جستجوست حل نشد این نکتہ تا نہ فہم کہ دوست

ایک طرف انسان کی تڑپ اور تجسس کا یہ عالم ہے کہ الی ربہا ناظرۃ۔
جو رب کی طرف رواں دواں جائیں گے تو دوسری یہ کیفیت بھی
ہمارے سامنے آتی ہے کہ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا زمین اپنے رب

کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا۔ اور تیرا رب اور فرشتے قطار در قطار زمین پر آئیں گے۔ کہ

ہر دو بے تاب اند از ذوقِ نظر

لیکن یہ تمام مراحل طے کس طرح ہوں گے؟ یہ "محکم خودی" حاصل کیسے ہو گی!! یہ اس دنیا میں اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ ہو۔ یعنی ایسا سخت ہو جا کہ کوئی اسے ہضم نہ کر سکے۔ کوئی اپنے اندر جذب نہ کر سکے۔ یہ کیسے ہو گا!!! اس خاکی تودے میں فولادی جوہر کیونکر پیدا ہو رہا ہے۔ یہ نازک سا شیشہ اپنے اندر ایسی سختی کیسے پیدا کرے گا کہ اس کا "زجاج صریف" تگ ہو جائے۔ اس کے لئے رموز و اسرار میں پورا لائحہ عمل مرتب کر کے دیا گیا ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ لیکن اس سب کا ماحصل ایک نکتہ ہے۔ اور یہی نکتہ دراصل کلامِ اقبال کا محور ہے۔ مرکز ہے۔ محیط ہے۔ سب کچھ ہے یہ نکتہ ہے۔ محمد رسول اللہ۔ فرماتے ہیں۔

نیز اگر جوہرِ حق نور کی پاک ہے تو — فر و فتح و بدن و فلاک ہے تو
نرم ہے بازوئے اندر شہ و حور — کہ شاہین شہ لولاک ہے تو

یہ ہے راز یک مومن کی پختگی کا۔ اس کی خودی کے استحکام کا۔ کہ شاہین شہ لولاک ہے تو۔ تو ان مقدس ہاتھوں کا پروردہ ہے جن کی شان یہ ہے کہ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (الفتح) تو ان ذاتِ گرامی کا شاہین ہے۔ جو دانائے سبل۔ ختم رسل۔ مولائے کل ہے جو معراج انسانیت کا مظہر کامل ہے جب تو ایسی رفیع الشان بارگاہ کا شاہین ہے تو تیرے

تمہیں آستیاں ہوئے ہیں کیا کام ہے۔ آہذا یہ تمام فضائیں اور فضاؤں کی پہنائیاں یہ سب پستیاں اور تمام بلندیاں۔ یہ ارض و سموات یہ تمام کائنات، اور اس کی قیود نا آشنا وسعتیں۔ اس شاہین شہ لولاک کے بازوؤں کے نیچے کیوں نہ ہوں۔ اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) کی طاعت عشق کے مرتبہ تک نہ پہنچ چکی ہو۔ رسولؐ کی اطاعت درحقیقت خدا کی اطاعت ہے اور یہ اطاعت قرآن کی اطاعت ہے۔ میسر ہوتی ہے کہ حضورؐ قرآن ہی کی طاعت سکھانے کو تشریف لائے تھے۔

قسم ہے تیرے پروردگار کی۔ ان میں سے کوئی بھی مومن نہیں ہو سکتا۔
جب تک کہ پیش نہ کریں تمام معاملات میں۔ جن میں اختلاف کرتے ہیں۔ اے رسول
تمہیں حاکم تسلیم نہ کریں۔ پھر تمہارے فیصلوں پر دل میں بھی کوئی تنگی
اور کوئی محسوس نہ کریں۔ بلکہ ان کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔ ۴/۶۵

یہ ایک نکتہ کے اندر امت کی مرکزیت، امیر کی اطاعت، وحدتِ افکار و عمل اور ان کے جیتے جاگتے نتائج یعنی تمکن فی الارض، شان و شوکت، حکومت و سطوت، زمین پر "آسمانی بادشاہت" کا قیام، سرفرازیاں اور سربلندیاں کامیابیاں اور کامرانیاں۔ اور اس کے بعد حیات آخروی میں۔ اعداء کی خندقوں میں آگے بڑھنے کی قوتیں۔ مدارج عالیہ، یہ سب کچھ اس کے اندر پوشیدہ ہے۔ مجھے ضمناً اس بحث کو یہاں چھوڑ دینا پڑا۔ ورنہ یہ لفظ وہ لفظ ہے۔ جس پر کلام اقبال سے ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

اقبال تمام شاعری اور شاعری کا سوز و گداز رہینِ کرم ہے محبتِ رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) کا جذبۂ اطاعت کا ماسی ذاتِ گرامی کی شعلہ ریز محبت ہے۔ جس نے اقبال کو اقبال بنا دیا۔ ورنہ یہ بھی کہیں "میر مشاعرہ" ہوا کرتے۔ جذبۂ اطاعتِ رسولؐ نے (جسے وہ عشق کہتے ہیں) اقبال کو اس انداز سے گداز کر رکھا ہے کہ اس کے بربطِ ہستی کے کسی تار کو چھیڑیئے اس میں سے نغمہ وہی پیدا ہوتا ہے۔ اسی چیز نے ان کے سامنے قرآنی حقائق کو بے نقاب کیا اور قرآنی حقائق نے ان کے کلام میں دمِ مسیحا اور ضربِ کلیم کے اعجاز پیدا کر دیئے۔ فطرت کی کرم گستری نے وہ دماغ عطا کیا تھا جو یکسر علم و حکمت تھا محبتِ رسولؐ کی موہبتِ عظمےٰ سے وہ قلب منور مل گیا جسے صہبائے ایمان کا مقدس آبگینہ کہا جائے ان دونوں کے امتزاج سے وہ نگاہ پیدا ہوئی۔ جو اشیاء کی حقیقت کو بے نقاب دیکھ لے۔ جو گل و خار کے نظر فریب امتیاز سے ہٹ کر شاخ و گل کے اندر جا کر مشاہدہ کرے کہ "درون او نہ گل باشد نہ خار است" اس نگہ حقیقت شناس کا نام ہے اقبال یعنی قلب و دماغ کا مجموعہ۔ ایمان و حکمت کا فشردہ۔ زیرکی و عشق کا عصارہ ادیب و بوعلی کا مرکب مجموعہ۔ رومی و رازی کا مشترکہ شاہکار۔ وہ مشرق مغرب کا مقامِ اتصال۔

غربیاں را زیرکی را زجیاست | شرقیاں را عشق را زنگانیاست
زیرکی از عشق گردد حق شناس | کارِ عشق از زیرکی محکم اساس
نیز از نقشِ عالمِ دیگر بہ | عشق را با زیرکی آمیزدہ

اور یہی وہ امتزاجی کیفیت ہے جو قرآن کریم ایک مومن کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے

اقبال رح

اور

کائنات

اقبالؒ اور کائنات

سائنس اور مسلمان

کائنات کے بارے میں کچھ سمجھنے یا کہنے سے پہلے اس حقیقت پر یقین رکھنا ضروری ہے کہ یہ ساری کائنات قرآن کے تابع ہے۔ کُل نظامِ کائنات نظامِ قرآن ہے اور اس میں بسنے والے انسانوں کے لئے قرآن مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ اسی دستورِ کامل کے ماتحت ساری کائنات درخشندہ و فرخندہ نظر آ رہی ہے۔ ہر وہ انسان جو قرآن کے قانون کو تسلیم کرے۔ مان لے یا ایمان لے آئے مسلمان ہے۔ یہ مغرب کی ستم ظریفی ہے کہ اس شخص یا جماعت میں جس نے قرآن کو مان لیا تاریخی طور پر ایک فقرہ نہیں کہتا کہ اس مسلم یا مسلم جماعت نے قرآن کی تحقیق کا کام بھی کیا تھا۔ حالانکہ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جو شخص کسی شے پر یقین کرے یا تو اس نے یقین سے پہلے تحقیق کر لی ہے یا یقین کے بعد اپنے شکوک رفع کرنے کے لئے تحقیق کر گیا۔ بہرحال دونوں حالتوں میں تحقیق ضروری ہے ورنہ وہ شخص اس کی طرف سے منہ موڑے گا۔

جب ہم مغرب کے کسی مصنف کی لکھی ہوئی تاریخِ سائنس کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ لکھتے ہیں کہ اس تاریخ کی ابتدا اہلِ مصر اور اہلِ بابل کے وقت سے کی

جاتی ہے۔ جنہوں نے اب سے تقریباً پانچ ہزار برس قبل منظم طور پر علم کا ذخیرہ فراہم کرنا شروع کیا تھا۔ اس کے بعد اس کا مصنف علم کی اس ترقی کا ذکر کرتا ہے جو مصری اور بابلی تہذیب و تمدن کے جانشینوں نے کی۔ یونانیوں اور رومیوں کے زریں عہد کے کارناموں کا ذکر شاندار الفاظ میں کیا جاتا ہے۔ طویل، بوابیس اہل یونان کے انکشافات کے لئے وقف ہوتے ہیں۔ اور پھر اس کا مصنف ایک ہی جست میں ایک ہزار برس کی عمر کو طے کر جاتا ہے۔ ابھی ہم ایک صفحہ پر اس نظام شمسی کا ذکر پڑھ رہے تھے جس کو بطلیموس نے چوتھی صدی عیسوی میں پیش کیا تھا اور ورق الٹتے ہی ایک دم ہماری نظروں کے سامنے کوپرنیکس کا بیان ہوتا ہے جس کا زمانہ چودھویں صدی کا ہے۔ گویا اس مصنف کے نزدیک یہ درمیانی ہزار برس سائنس کی تاریخ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ہمارے ذہن جو قدرت میں ہر جگہ تسلسل اور تدریجی ارتقاء کو دیکھنے کے عادی ہیں اس عدم تسلسل کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ کوئی سمجھدار انسان جو بنی نوع کے ارتقاء کی تاریخ سے واقف ہے۔ اسے قبول نہیں کر سکتا کہ دس صدیوں تک انسانوں نے قدرت کے علم میں کوئی ترقی نہیں کی۔

اور مسلم کا یہ عالم کہ اس کی تحقیق کی قرآن شریف شہادت دے رہا ہے۔

"جو کھڑے بیٹھے اور سوتے الٰہی اعمال کے تصور سے غافل نہیں ہوتے اور جو کائنات ارضی و سماء پر غور کرنے کے بعد یہ اعلان کرتے ہیں کہ اے رب دنیا میں کوئی چیز بلا مقصد پیدا نہیں کی گئی۔"

(سورہ آل عمران ۱۹۱)

مامون رشید (عباسی خلیفہ) کے عہد میں ۱۷۲ رصد گاہیں اجرام سماوی کے معائنہ کے لئے نصب تھیں۔ حیوانات۔ طیور جمادات اور نباتات پر ۲۴ ہزار کتب تصنیف ہو چکی تھیں۔ وہ کھڑیاں بنا رہا تھا۔ انجن چلانے کی کوشش میں تھا۔ زمین کو ناپ رہا تھا۔ اور زمین و آفتاب کا درمیانی فاصلہ معلوم کر رہا تھا۔ تگ و دو جستجو اور تلاشِ مسلسل کا نام عشق ہے۔ یہی ذوقِ تحقیق مسلمان کی زندگی کا جزوِ اعظم رہا ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ عقلانہ زندگی بسر نہیں کی۔ جبکہ۔

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقام صفات عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات عشق حیات و ممات

علم ہے پیدا سوال عشق ہے پنہاں جواب

عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں
عشق کے ادنیٰ غلام صاحب تاج و نگیں
عشق مکان و مکیں۔ عشق زمان و زمیں

عشق سراپا یقیں اور یقیں فتح باب

شرحِ محبت میں ہے عشرت منزل حرام
شورشِ ہوش و خرد منزلِ دل ہے خام
عقل ہے بسمل خراب عشق ہے فاضل حرام

علم ہے ابن الکتاب عشق ہے ام الکتاب

اِس شرح و بسط سے معلوم ہوا کہ مسلم کا نصب العین کیا رہا ہے اور وہ سائنس کی دنیا میں کس قدر بلند مقام پر تھا۔ اور اس کی فطرت کس قدر غور و فکر کی فطرت تھی۔ جسے اللہ نے ہدایت فرمائی۔

اللہ وہ ہے جس نے آسمان سے بارش برسا کر مختلف قسم کے نباتات اُگائے۔ سبز رنگ پودے پیدا کر کے اُن سے خوشے نکالے اور کھجوروں کے ساتھ پھلوں کے وہ گچھے لگائے جن تک تمھاری رسائی ہو سکتی ہے۔ اللہ نے مختلف اور مماثل قسم کے انگور۔ زیتون اور انار دل کی جنتیں پیدا کیں۔ پھلوں کے لگنے اور پکنے پر غور کرو۔ ان نباتات میں اہلِ ایمان کے لئے معجزات و اسباق موجود ہیں" (سورۂ انعام ۱۱)

زمانۂ حال کے سائنسی مورخوں کو جب اس فروگذاشت کا احساس ہوا تو اُن میں سے جو لوگ کسی قدر کم متعصب اور تنگ نظر تھے اُنھوں نے اعتراف کرنا شروع کیا کہ اس درمیانی ایک ہزار برس میں عربوں اور دوسری مسلم قوموں نے علم کی شمع کو روشن رکھا لیکن ایک عرصہ کی تنگ نظری اور تعصب سے چونکہ یہ لوگ بھی اپنے دل و دماغ کو پوری طرح پاک اور صاف نہیں کر سکے اس لئے اس اعتراف کے باوجود یہی کہتے رہے کہ مسلم اقوام میں اُپج کچھ نہیں تھی اور نہ اُنھوں نے کوئی بڑے انکشاف کئے بلکہ اُن کا کارنامہ صرف اسی قدر ہے کہ اُنھوں نے اپنے پیشروؤں کی معلومات کو زندہ رکھا اور نشاۃ ثانیہ کے بعد اسے جوں کا توں یورپی اقوام کے حوالہ کر دیا۔

مغرب کو بجلی پر بڑا ناز ہے اور ڈھینگ مارتا ہے کہ یہ ہمارا اعجاز ہے اور ہم نے بجلی کی قوت سے زمین پر آباد ہر شے کو زندگی دی ہے لیکن قرآن اس بجلی کے متعلق چھ

اعلان کر چکا ہے۔

"بجلی کی چمک جس سے تم میں بیم و رجا کی کشمکش پیدا ہو جاتی ہے اللہ کے معجزات تخلیق میں سے ہے۔ رب کائنات آسمانوں سے بارش برسا کر (اور ناسٹر دجن کو زمین پر ڈال کر) مردہ زمین کو حیات نو عطا کرتا ہے۔ ارباب عقل کے لئے ابر و برق میں اسباق موجود ہیں"

(روم - ۲۴)

انسانی بدن کی طرح زمین بھی کئی بیماریوں کا شکار بن جایا کرتی ہے۔ آسمانی بجلی زمین کے ان تمام روگوں کا واحد علاج ہے۔ جب بجلی کی لہریں ہوا سے گزر کر زمین کو چھوتی ہیں تو مردہ زمین کی نس نس میں عناصر حیات بیدار ہو جاتے ہیں اور زمین تولید کے لئے پھر تیار ہو جاتی ہے۔ مسلمان سائنسدان نے قرآن بارش کا تجزیہ کیا اور ثابت کیا کہ اس پانی میں وہ گیسیں موجود ہیں جو شادابیوں کا باعث ہیں۔ حضرت علامہ نے بارش کی زبان بن کر اس حقیقت کی تائید فرمائی ہے۔

مجھ کو قدرت نے سکھایا درد افشاں ہونا
نالۂ شاہد رحمت کا حدی خواں ہونا
غم زدائے دل افسردہ دہقاں ہونا
رونق بزم جوانان گلستاں ہونا

بن کے گیسوئے بتی پہ بکھر جاتا ہوں
شانۂ موجۂ صرصر سے سنور جاتا ہوں
سبزۂ مزرع نوخیز کی امید ہوں میں
زاد ابر ہوں پروردۂ خورشید ہوں میں

چشمۂ کوہ کو دی شورشِ قلزم میں نے
اور پرندوں کو کیا محوِ ترنم میں نے
سبزہ و گل کے مکدر ہو کے کیا قم میں نے
غنچۂ گل کو دیا ذوقِ تبسم میں نے
فیض سے میرے نمونے ہیں شبستانوں کے
جھونپڑے دامنِ کہسار میں دہقانوں کے

مغرب نے آج معلوم کیا ہے کہ زمین کو چھیدنے کے علاوہ سلفورک ایسڈ، فاسفورک ایسڈ، نائٹرک ایسڈ اور پوٹاش کی بھی ضرورت ہے لیکن رب کائنات نے پہلے سے ہی اس کی ضرورت کے سامان فراہم کر رکھے ہیں۔ اگر ہم خود ان چیزوں کی تلاش میں نکلتے اور پہاڑ کھودتے پھرتے تو صدیاں صرف ہو جاتیں اور ممکن ہے کہ پھر بھی کوئی مفید نتیجہ نہ نکلتا لیکن اللہ نے اپنے بندوں کو اس علم سے بھی آگاہ کیا۔

"کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے فضائی بجلیوں سے پانی اتارا جو زمین کی درزوں میں داخل ہو کر چشموں کی صورت میں باہر نکل آیا۔ پھر اس سے چشموں سے (جن میں مختلف عناصر شامل تھے) رنگ برنگ کھیتیاں نمودار ہوئیں۔" (۲۲)

رب رحیم نے ان مشکلوں کو یوں حل کیا کہ پہاڑوں پر برف جمع کر دی جو پگھل کر پرزوں کی شکلوں میں چلی گئی اور جب یہ پانی چشمہ بن کر کہیں سے نکلا تو پوٹاش اور سلفر وغیرہ کی ایک دنیا ہمراہ لے آیا۔ جسے دریا بنے اور دریا نہروں میں [illegible] اس طرح یہ پانی تمام روز مرہ کی

کو سب سے گہرائیوں تک پہنچا۔ مغرب نے ان غیر پوشیدہ خزانوں کو پوشیدہ کہا۔ اور کہا کہ ہمارے
علم و عرفان کے فیض کا اعجاز ہے کہ یہ خزانے دنیا پر نمایاں ہو گئے ہیں۔ علامہ فرماتے ہیں۔

ہوا نہ زور سے اس کے کوئی گریباں چاک
اگرچہ مغربیوں کا جنوں بھی تھا چالاک
یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا
دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بے باک
ترے بصر پہ اگر ہو تو یہ مانعِ نگاہ بھی ہے
وگرنہ آگ ہے مومن جہاں خس و خاشاک
زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

واقعہ یہ ہے کہ چند مستشرقین کے سوا یہ مورخ، مصنف یا عوام مسلمانوں کی تحریروں اور
ورثہ کی کتابوں پر دسترس نہیں رکھتے۔ مسلمانوں کے کارناموں اور ان کے تہذیب
و تمدن کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے یہ لوگ ان تحریروں پر بھروسہ کرتے ہیں
جو صلیبی جنگوں کے زمانہ میں اور اس کے بعد پادریوں اور راہبانِ کلیسا نے گھڑی ہیں
یہ لوگ اپنے مذہبی تعصب کی بنا پر رسالے میں اور واقعات و تاریخ میں بیان کئے
ہیں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا کہ عیسائی اقوام کی ہمدردی اور امداد حاصل کر لیں۔
بعد کے مورخوں اور مصنفوں نے انہی کتابوں سے اپنا مواد حاصل کیا اور وہی واقعات
ان کی تاریخ میں درج کر دیئے گئے۔ جو راہبانِ کلیسا نے گھڑ لئے تھے۔

ترے لئے داد محشر کو شرمسار کرے گا
کتاب عرفی و نظیری و سعدی و رومی

حال میں سائنسی تاریخ میں ایک اور رجحان پیدا ہو چلا ہے جس سے مسلم عوام کم واقف ہیں۔ یہ گویا ایک قسم کی منظم سازش ہے جو متمدن دنیا میں مسلمانوں کے خلاف پھیل رہی ہے، اور اگر وقت پر اس کا سدِ باب نہ کیا گیا تو ہمیں اندیشہ ہے کہ سائنس کی تاریخ سے مسلمانوں کا نام حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گا۔ مسلمانوں کے جن انکشافوں اور کارناموں سے اب تک ان کے بدترین دشمن بھی انکار نہیں کر سکتے تھے۔ انہی انکشافوں کا سہرا اب بتدریج دوسرے لوگوں کے سر باندھا جا رہا ہے۔ اگر ہم افراد اور قوموں کی نفسیات پر غور کریں تو اس رجحان کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں بعض افراد اس مربی کے بارِ احسان کو برداشت نہیں کر سکتے جس کی طاقت اور ثروت زائل ہو چکی ہو۔ یہ لوگ ہر قسم کی ممکنہ کوشش اس امر کے ثابت کرنے میں صرف کریں گے کہ ان کی گردن پر اس مربی کا کوئی احسان نہیں ہے۔ اس کے ساتھ وہ اس مربی سے انتقام لینے کی بھی کوشش کریں گے کہ اس نے اپنے احسان سے انھیں نادم کیا تھا۔ اقوام کا بھی یہی حال ہوتا ہے اور ہم کو خود اپنے زمانہ میں اس کا تجربہ ہو رہا ہے۔ میرے خیال میں نازی جرمنی میں اور دوسرے فاشسٹی ملکوں میں یہودیوں کے خلاف جو جذبۂ نفرت بھڑکا ہوا ہے اس کی اقتصادی اور سیاسی وجوہ کے علاوہ یہی نفسیاتی وجہ بھی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ پھر کیا تعجب ہے کہ اگر قومیں کی قومیں مسلمانوں سے انتقام لینے پر تلی ہوئی ہیں کہ ہزار برس تک وہ ذہنی و سیاسی حیثیت سے سلری دنیا پر چھائے ہیں۔ اور مسلمان کی سادگی دیکھئے۔

شہری ہو دیہاتی ہو مسلمان ہے سادہ
مانندِ بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن
میراث میں آئی ہے انھیں مسندِ ارشاد

زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

مسلمان کی اپنی شخصیت سے بغاوت کا نتیجہ سامنے ہے۔ ورٹز کانٹور جرمنی زبان میں علوم ریاضی کے متعلق لکھتا لکھتا عربوں کے متعلق لکھتا ہے کہ۔

"یہ وہ لوگ تھے جو صدیوں تک اپنے ہمسایوں کے تمام تہذیب و تمدن کے اثرات سے باہر تھے جنھوں نے خود اس تمام عرصہ میں دوسروں پر کوئی تمدنی اثر نہیں ڈالا۔ پھر یکایک ان لوگوں نے اپنا مذہب اپنے قانون اور اپنی زبان کو دوسری قوموں پر اس حد تک مسلط کیا جس کی کوئی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ سب کچھ اس قدر غیر معمولی واقعات ہیں کہ ان کی وجوہات کا کھوج لگانا بے سود نہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ذہنی بلوغ اور پختگی کا یہ دفعتاً ظہور بذاتِ خود ناممکن ہے۔"

گویا کانٹور کا یہ مطلب ہے کہ عربوں میں یہ ذاتی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ اس ذہنی بلندی پر آپ سے آپ پہنچ سکتے۔ اس ایقان کو اپنے دماغ میں جما کر وہ عربوں کی تاریخ ریاضی تحریر کرتا ہے۔ اور محمد بن موسیٰ الخوارزمی اور دوسرے مسلمان علماء کے کارناموں کو یونانیوں اور دوسری قوموں کے آغوش میں ڈال دیتا ہے۔ پھر ہمارے اکثر بھائی بندوں کو تنکے کا سہارا مل جاتا ہے اور وہ کانٹور کے اور اسی کی ذہنیت رکھنے والے مغربی مورخین کے حوالہ سے مسلمانوں کے تمام کارناموں کو اپنے ہم قوم افراد سے منسوب کرنے لگتے ہیں۔

اغیار جان توڑ کوشش میں ہیں کہ مسلمانوں کے کارناموں کو اپنا کر علم و حکمت کی تاریخ سے مسلمانوں کا نام خارج کر دیا جائے۔ پیسہ کی ان کے ہاں کمی نہیں ہے اور

پریس ان کے ہاتھ میں ہے' اخباروں میں آرٹیکل اور رسالوں میں مضامین نکلتے ہیں۔ آئے دن مقالے اور کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ پھر یہ زمانہ ہی پروپیگنڈے کا ہے جو اپنا ڈھول جس قدر زیادہ پیٹے دنیا اُسے ماننے کے لئے تیار ہو جاتی ہے لیکن جب غیروں سے توقع ہی نہیں تو ان کی شکایت کیا کی جائے ہمیں تو رونا اپنوں کا ہے جو پہلے ہی سے احساسِ پستی میں مبتلا ہیں۔ اور اب اغیار کے پراپیگنڈے سے بھی متاثر ہو رہے ہیں۔ سائنس اور خصوصاً ریاضی کو مسلمان طالب علم ایک مصیبت اور ہوّا سمجھتے ہیں۔ اور یہ صرف عوام بلکہ پڑھے لکھے مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات جم گئی ہے کہ مسلمانوں کو یہ علوم آتے ہی نہیں اب مسلمانوں کے لئے یہ چار سطریں رہ گئی ہیں۔

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن تم ہو
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن تم ہو
بجلیاں جس میں ہیں بیتاب وہ خرمن تم ہو
ٹوکتے ہیں جو اسلاف کے مدفن تم ہو

یہ طعنے غیروں کی طرف سے نہیں اپنوں کی طرف سے ملتے ہیں غیر ہمیں ان الفاظ سے یاد کرتے ہیں اور یوں مخاطب کرتے ہیں۔

شور ہے ہو گئے دنیا سے مسلماں نابود
ہم یہ کہتے ہیں کہ تھے بھی کہیں مسلم موجود
وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

یہ بھی قسمت کا عجیب پھیر ہے کہ ہمیں اپنے اسلاف کے کارنامے بیان کرنے

کے لئے مغربی علماء اور مورخین سے سند لانی پڑتی ہے۔ ورنہ محض ہماری بات یا عربی اور فارسی تاریخوں کی شہادت ہمارے جدید تعلیم یافتہ بھائی کیوں ماننے لگے۔ ان کی تشفی اور اطمینان کی خاطر یہ کرنا پڑتا ہے کہ مغرب کی ورق گردانی کے بعد استدلال نوٹ کر کے ان کے سامنے پیش کریں۔ کس قدر باعثِ ندامت ہے ہمارے لئے۔

رہ گئی اپنے لئے ایک خیالی دنیا
ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا

اس کی مصنف پروفیسر کیوری نے ریاضی کی تاریخ لکھی ہے اور وہ ہمارے متعلق رقمطراز ہیں:

"تمدن کی تاریخ میں عرب ایک غیر معمولی منظر پیش کرتے ہیں۔ جزیرہ نمائے عرب کے گمنام جاہل اور منتشر قبیلے جس کو سلطنت اور جنگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا دس برس کے اندر مذہبی جوش کی بھٹی میں سے گذر کر ایک طاقتور قوم بن جاتے ہیں۔ اور پھر یہ قوم ایک صدی کے عرصہ میں اپنی حکومت ہندوستان سے لیکر شمالی افریقہ اور ہسپانیہ تک پھیلا دیتی ہے۔ اس فتح و ظفر کے ایک سال بعد یہ لوگ علمی معاملات میں دنیا کی رہبری کرنے لگتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان اپنے زمانے کے بڑے عالم بن جاتے ہیں۔"

مغربی مورخوں یورپ کے بیشتر دنوں اور سائنس دانوں کے سرائن انکشافات

کا سہرا رکھا ہے جو ایک عرصہ پہلے عربوں نے کئے تھے

"چھٹی صدی سے سولھویں صدی تک براعظم یورپ نے کوئی ہیئت داں پیدا نہیں کیا اس زمانہ میں علم و ادب کا سارا میدان عرب مشاہیر سے بھرا ہوا تھا۔ یورپ کا کوئی باشندہ اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ ان ہیئت دانوں کے انکشافات اصل ہیں۔ ان انکشافوں سے علم ریاضی کی ان ترقی یافتہ اور اعلیٰ قسم کی معلومات کا پتہ چلتا ہے جن کو عربوں نے دریافت کیا تھا۔"

مگر وہ علم کے موتی جواہر اپنے آبا کے
جو دیکھو ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

اب دیکھئے کہ اسلام نے سائنس کی کیا خدمات انجام دی ہیں؟

ظہور اسلام سے قبل مشرق قریب اور مغرب کے تمام ملکوں پر کلاسیکی یونانی فلسفہ مسلط ہو چکا تھا اور ہر کس علمی مسئلہ کے متعلق ارسطو کا قول فیصل سمجھا جاتا تھا۔ یونانیوں کے نزدیک علم حاصل کرنے کا طریقہ خیال اور فکر ہی تھا۔ تجربہ اور مشاہدہ کی ان کے ہاں کوئی حقیقت نہیں تھی۔ کیونکہ اُن کے خیال میں تجربہ اور مشاہدہ سے صرف قیاس علم حاصل ہوتا ہے۔ حقیقی علم حاصل نہیں ہوتا۔

منظر چمنستان کے زیبا ہوں کہ نازیبا
محروم عمل نرگس مجبور تماشا ہے

کائنات کے متعلق ان کا تصور سکونیاتی تھا جس کا ثبوت ان کی جیومیٹری ہے ملتا ہے جس میں حرکت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ انہیں یقین تھا کہ اگر لفظوں فصلوں

اور شکلوں کو حرکت دی جائے تو اس سے ان کی ہیئت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ نہ صرف سائنس میں بلکہ فنونِ لطیفہ میں بھی یونانیوں کا آئیڈیل سکونیاتی تھا۔ چنانچہ جتنے قدیم یونانی مجسمے دستیاب ہوتے ہیں اُن میں شکلوں کو سکون اور جمود کی حالت میں بتایا گیا ہے۔ اور اس کے برعکس تاریخِ اسلام بتاتی ہے کہ مسلمان۔

چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستان کی
یہ ہستی دانا ہے بینا ہے توانا ہے

اسلام نے سب سے پہلے یونانیوں کے فلسفہ اور سائنس کے خلاف بغاوت کی۔ اسلام نے لوگوں کو سکھایا کہ دنیا جیسی بھی کچھ ہے اسی سے کام لو اور اسی کے ساتھ دلچسپی رکھو۔ خواب و خیال کی دنیا سے ایک حقیقت شناس مسلم کو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دنیا میں
انسان کی ہر فطرت سرگرمِ تقاضا ہے

حضرت علامہ اقبالؒ نے تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ پر جو لکچر دیے ہیں ان میں اس نکتہ پر تفصیلی بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق کائنات ساکن اور جامد نہیں ہے۔ بلکہ متحرک اور تغیر پذیر ہے۔ قدرت کے کارخانے میں سکون ممکن نہیں ہے۔ برگساں نے تخلیقی ارتقاء کا جو مفہوم قائم کیا ہے۔ تو کتاب اللہ میں متعدد مقامات پر موجود ہے۔ چنانچہ خالقِ عالم کے متعلق بھی کہا گیا ہے کہ کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِی شَاْنٍ یونانیوں کے برخلاف کائنات کا یہ حرکیاتی تصور حقیقت کے بالکل قریب ہے اس کے علاوہ تفصیل کے ساتھ دلائل سے ثابت کیا ہے کہ قرآن نے یونانیوں کی تردید

کی ہے۔ یونانیوں کے نزدیک علم حاصل کرنے کا واحد طریقہ فکر و خیال تھا۔ لیکن قرآن مجید نے بتایا کہ تحصیلِ علم کے دو طریقے ہیں ایک تاریخ اور دوسرے مشاہدۂ قدرت۔"

"ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ محض تماشے کی خاطر پیدا نہیں کیا۔" (دخان ۳۷)

قرآن کریم نے کائنات کی تمام چیزوں کو انسان کی ضروریات کے لیے بنایا ہے اور انسان کو دعوت دی ہے کہ وہ ہر علم میں چھان بین کرے۔ مشاہدات پر فکر کرے ورنہ تاریخ کائنات پر غور کرے۔

"کیا دیکھتے نہیں کہ چوپائے ہم نے پیدا کیے لیکن ان کے مالک انسان بنے ہوئے ہیں۔ ہم نے ہاتھی، گائے اونٹ اور گھوڑے جیسے جانوروں کو ان کا یوں مطیع کر دیا کہ وہ ان پر سوار ہوتے ہیں اور انہیں کھاتے بھی ہیں۔ ان کے بالوں، چمڑوں، ہڈیوں اور گوبر وغیرہ میں ان کے لیے کس قدر فوائد ہیں اور پھر غور کریں کہ ہم خون کے کیوں اکر دودھ ان کے لیے مہیا کرتے ہیں۔ کیا وہ اب بھی شکر گزار نہ ہوں گے؟" (یٰسین ۷۲)

قرآن کی تلقین ہے کہ اگر حقیقت معلوم کرنا ہو تو چاند، سورج اور دوسرے مظاہر قدرت کو دیکھو۔ ایک مسلم کا فرض ہے کہ وہ ان نشانیوں پر غور کرے اور ان کے پاس سے اس طرح نہ گزر جائے کہ وہ بہرا اور اندھا ہے۔

مغرب کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی ہے پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

یہیں مشاہدات سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے یہیں سے جدید سائنس کی ابتدا ہوتی ہے۔ اور یہی تمام موجودہ علوم و فنون کا بنیادی اصول ہے۔ اگر اسلام نے تجربہ اور مشاہدہ کے اس اصول کو پیش نہ کیا ہوتا تو دنیا ابھی تک افلاطون اور ارسطو کی غلامی میں چکر کھاتی رہتی۔

حقیقت یہ ہے کہ جس چراغ سے مغرب روشن ہے۔ اس میں ہمارے ہی تمدن کا تیل جل رہا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں۔

سرزمینِ قرطبہ بھی دیدہ مسلم کا نور
ظلمتِ مغرب میں جو روشن تھی مثلِ شمعِ طور
بجھ گئے بزمِ ہست و بود پریشاں ہو گئی
اور دنیا تہذیبِ مغرب کا فروزاں کر گئی
تیرا اس تہذیب کی یہ سرزمین پاک ہے
جس سے تاکِ گلشنِ یورپ کی رگ نمناک ہے

ایک عرصہ تک غلط طور پر یہ تسلیم کیا جاتا رہا کہ سائنس میں تجربہ اور مشاہدہ کے طریقے یورپ والوں نے اور خاص کر راجر بیکن نے دریافت کیا۔ حالانکہ خود بیکن کی سائنٹفک تعلیم اندلس کی مسلم جامعات میں ہوئی اور اس پر ابن الہیثم کی کتاب کا اثر تھا چنانچہ بیکن نے اس کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ اور برفو نے اپنی کتاب Mirage of Arab Science میں اس نکتہ کو وضاحت سے بیان کیا ہے جو ذیل میں لکھتا ہے۔

"راجہ بیکن نے آکسفورڈ میں عربی زبان اور عربی سائنس کی تعلیم حاصل کی۔ سائنس میں تجربی طریقہ کو داخل کرنے کا سہرا نہ تو راجر بیکن کے اور نہ اس کے ہمنام فرانسیس بیکن کے سر ہے۔ راجر بیکن کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ عیسائی یورپ میں مسلم سائنس اور طریقہ کا حواری ہے اور وہ یہ کہنے سے کبھی نہیں تھکتا کہ عربی زبان اور عربی سائنس سے واقفیت اس کے معاصرین کے لئے حقیقی علم حاصل کرنے کا واحد ذریعہ تھی یہ بحث کہ عربی طریقہ کا موجد کون تھا۔ یورپی تمدن کی ابتداء کے متعلق غلط فہمیاں پھیلانے کی کوششوں کا ایک جزو ہے۔ بیکن کے زمانہ تک عربوں کا تجربی طریقہ یورپ میں عام طور پر پھیل چکا تھا۔ اور بڑے شوق سے سیکھا جاتا تھا۔" (صفحہ ۳۵۵)

دوسری جگہ یہی مصنف لکھتا ہے۔

"عرب تمدن نے موجودہ دنیا کو جو اہم ترین عطیہ دیا ہے وہ سائنس ہے۔ لیکن یہ صرف سائنس ہی نہیں تھی جس نے یورپ کے مردہ قالب میں دوبارہ جان ڈالی۔ اسلامی تمدن کے دوسرے اور متعدد اثرات نے یورپی زندگی میں روشنی پیدا کی۔" (صفحہ ۴۵۴)

ایک اور جگہ رقمطراز ہے۔

"اگرچہ یورپی ارتقا کا کوئی ایک شعبہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اسلامی تہذیب کا فیصلہ کن اثر نہ پایا جاتا ہو کہیں اس کا سب سے زیادہ واضح اور سب سے زیادہ اہم اثر اس شعبہ پر پڑا ہے جو موجودہ دنیا کا امتیازی شعبہ ہے اور جس میں ہماری ساری ترقی کا دارومدار ہے یعنی سائنس اور سائنٹیفک ذہنیت۔ مغرب کی سائنس کا احسان ہماری سائنس پر محض اس قدر نہیں ہے کہ انھوں نے چند عجیب و غریب انکشاف کئے ہیں یا چند انقلاب انگیز نظریے پیش کئے ہوں۔ ہماری سائنس عرب تہذیب کی کہیں زیادہ ممنون ہے۔ یعنی سائنس کا وجود ہی عربوں کی بدولت ہے۔ جس چیز کو ہم سائنس کہتے ہیں وہ یورپ میں ایک نئی ذہنیت کے تحت پیدا ہوئی۔ یہ ذہنیت تحقیق و تجسس کے نئے طریقوں یعنی تجربوں، مشاہدوں، پیمائش اور علم ریاضی کے اُن نئے طریقوں پر مبنی تھی جن سے یونانی بالکل ناواقف تھے۔ اس ذہنیت اور ان طریقوں کو یورپ میں عربوں نے رائج کیا۔" (صفحہ ۱۹۰)

ان حقائق کے پیش نظر دنیا کو مسلمان کے بارے میں کہنا پڑ گیا کہ

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
قمر ہے جس کی گردِ راہ وہ کارواں تو ہے

مولانا روم نے مثنوی میں عالمگیر تجاذب کی تشریح میں اشعار کہے ہیں ان کا ترجمہ یہ ہے۔

"اس کائنات کا ہر ذرہ ہر دوسرے ذرہ کو اس طرح کھینچتا ہے جیسے کہربا پتھر گھاس کے تنکوں کو کھینچتا ہے ہے۔ آسمان، اور زمین دونوں باہم لوہے، اور مقناطیس کی طرح ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں۔"

یہ مثنوی بارھویں صدی ع میں لکھی گئی ہے اور یورپ کا دعویٰ ہے کہ اس حقیقت کا انکشاف نیوٹن نے کیا حالانکہ نیوٹن کا زمانہ پانچ سو سال بعد کا ہے۔ علم ریاضی کے متعلق بھی عرب پیش پیش ہیں صفر کا استعمال سب سے پہلے محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے کیا ہے۔ اس کا زمانہ نویں صدی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ الجبرا کا موجد بھی خوارزمی ہی ہے۔ اور اسے ترقی دینے والوں میں ابوالوفا۔ الکوہی۔ ابوالجود۔ محمد بن لیث ابومحمود الخوجندی۔ ابوبکر۔ محمد بن الحسین الکرجی مشہور ہیں۔ عمر خیام نیشاپوری۔ ملک شاہ سلجوقی کا خاص ماہر فلکیات تھا۔ حضرت علامہؒ نے مسلمان کی تعریف ایک شعر میں کی ہے ؎

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

گوئٹے زندگی کی وہ منزل جس میں انسانی شعور غیر پختہ ہوتا ہے زندگی کی آئینہ دار نہیں ہوتی۔ قرآن کریم کے نزدیک یہ زندگی اصل

معنوں میں زندگی کہلانے کی مستحق ہی نہیں۔

یہ زندگی تو محض کھیلنے کودنے کی زندگی ہے۔ بچپن کا زمانہ ہے۔ زندگی تو درحقیقت اس کے بعد کی منزل ہے۔"

(۲۹/۶۴)

علامہ اقبالؒ نے بھی اس دور کو سطحی تجسس کا دور کہا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

تکتے رہنا ہائے وہ پہروں تلک سوئے قمر
وہ پھٹے بادل میں بے آوازِ پا اُس کا سفر
پوچھنا رہ رہ کے اس کے کوہ و صحرا کی خبر
اور وہ حیرت دروغِ مصلحت آمیز پر
آنکھ وقفِ دید تھی لب مائلِ گفتار تھا
دل نہ تھا یہ سراپا ذوقِ استفسار تھا

قرآن نے اس زندگی کو دیباچہ کہا ہے۔

اِنَّ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ۔

"یہ موجودہ زندگی تو محض دیباچہ ہے اصل کتاب تو ابھی شروع ہونے والی ہے۔"

علامہ نے فرمایا ہے۔

حدیثِ سوز و ساز ما دراز است
بہانہ دیباچہ افسانہ ما!

ارتقا کے ضمن میں قرآن میں بیان ہوا ہے کہ اللہ ایک تدبیر کرتا ہے پھر اُسے تکمیل تک پہنچانے کے لئے مختلف مراحل کراتا ہے۔ ایک ایک منزل کا نام یوم ہے۔ قوموں کی زندگی میں یہ دن گردش لیل و نہار کا نام نہیں بلکہ ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔

"وہ آسمان سے زمین کی طرف تدبیر امور کرتا ہے پھر وہ (پختگی اختیار کرکے) اس کی جانب ہوتا ہے۔ ایک دن میں جس کی مقدار انسانوں کے تعداد شمار کے لحاظ سے ہزار سال ہوگی ہے" ۳۲/۵

علامہ کا یہ ارشاد کہ زندگی کو پختگی تک پہنچنے کے لئے بے شمار منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں۔

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے، اب میرا انتظار کر

پروانے کی زندگی کے بارے میں ارشاد ہے۔

سیماب وار رکھتی ہے تیری ادا مجھے
آدابِ عشق تو نے سکھائے ہیں کیا مجھے

علامہ کے نزدیک شمع کی شکست اور پرواز کی راکھ اس لئے نہیں ہوتی کہ خاکستر بن کر رہ جائے۔ بلکہ اس لئے کہ اس میں پہلے سے بھی زیادہ تڑپ، چمک، حرارت پیدا ہو جائے۔ انسانی پیدائش میں ہر چند نورانیت کا عنصر موجود ہے، لیکن اس کی مادیت کا عنصر زیادہ غالب ہے۔ اس لئے حقائق پر ظلمتوں کے پردے پڑ

رہتے ہیں۔ اس کی شکست اس لئے ہوگی۔ اس کے بعد شعلہ کی حرارتیں سمٹ کر شرر بن جائیں اور وہ اس آتشدانِ خاکی سے اُڑ کر فضائے نور کی ان وسعتوں میں جا پہنچے جن کے لئے شرق و غرب کی قیود نہیں ہے۔ جو جگہ یعنی مکانیت کے تصور سے باہر نہیں۔

"یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ملائکہ نہایت آسودگی کی حالت میں وفات دیتے ہیں یہ کہتے ہوئے کہ تم پر سلامتی ہو۔ آیئے جنت میں داخل ہو جایئے بوجہ ان اعمال کے جو تم نے کئے ہیں۔" (۱۶/۳۲)

یہی وہ نورِ حیات ہے زندگی ہے شرر ہے جس کے سامنے موت عاجز ہے۔ موت عناصر کو منتشر کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ مگر زندگی کو نہیں۔ علامہ نے قضا کی بے بسی کا نقشہ کھینچا ہے۔

اڑاتی ہوں میں رفتِ ہستی کے پرزے
بجھاتی ہوں میں زندگی کا شرارا
مگر ایک ہستی ہے دنیا میں ایسی
وہ آتش ہے میں سامنے اس کے پارا
شرر بن کے رہتی ہے انساں کے دل میں
وہ ہے نورِ حق کی آنکھوں کا تارا

زندگی کا تسلسل کہیں ختم نہیں ہوتا۔ البتہ کچھ مقامات ایسے آتے ہیں۔ جہاں ذرا دم لینا مقصود ہوتا ہے۔ اس سے اس کے تسلسل میں فرق نہیں آتا۔ قرآن کا یہ ہے۔ جب نفوس کو پھر سے اٹھایا جائے گا تو خاک کی پریشانی کے بعد

پھر "دل" بن جائے گی۔ علامہ فرماتے ہیں۔

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے
جو اب مشکل ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

عمل صالح سے یہ جنت سے نکلا ہوا (گرا ہوا) آدم انسانیت کی معراج کو پہنچکر فرشتوں کی نظر میں قابلِ رشک بن جاتا ہے۔ جب اسے دوبارہ جنت میں داخل کیا جاتا ہے۔ تو فرشتوں کے دعوے غلط ہو کر رہ جاتے ہیں اور وہ آدمِ خاکی کے استقبال کا اہتمام دیکھ کر سہم جاتے ہیں کہ ہم نے کیا دلیل پیش کی تھی اور نتیجہ کیا برآمد ہوا ہے۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

قرآن کریم میں ہے۔

"بے شک ہم نے انسان کو بہترین ہیئت میں پیدا کیا پھر اسے اس کے اعمال کی بدولت نچلے سے نچلے درجہ میں لوٹا دیا۔ مگر سوائے ان کے جنھوں نے ایمان کے ساتھ اعمال صالح کئے پھر ان کے لئے غیر منقطع اجر ہے"۔

(والتین ۴)

یورپ کے مادہ پرست انسان کی پرواز اس دنیا تک یا زیادہ سے زیادہ کسی قریبی ستارہ تک محدود ہے۔ جو صرف اسی زندگی سے متعلق ہے۔ لیکن مردِ مومن بہت بلند ہے۔

قسمت بدو گر حق بہ اس ملت کا آنگیں جس کے جوانوں کو ہے تلخابِ حیات

حقیقت یہ ہے کہ قوم کی تقدیر میں ہمیشہ ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ان کے قلب و دماغ کی صلاحیتیں۔ ان کے خونِ گرم کی حرارتیں۔ ان کا زورِ بازو۔ ان کا جوش کردار۔ امڈتے ہوئے سیلاب کی طرح ابھرتا ہے، اور راستے کی ہر ابھرنے والی قوت کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے۔

جوانی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اُن کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

اور نمیاں ہمت سے کہتے ہیں کہ قوم کے یہ نوجوان دل و دماغ جن کا ضمیر نور آب و گل ہی ہے۔ نئی نسل نشو و نما اور صحیح تعلیم و تربیت کی فکر کیجئے کہ اگر یہ نوجوان ہاتھ سے نکل گئے تو قوم کی قوم سنبھل جائے گی۔ اور اگر یہی غلط راستے پر چل پڑے تو پھر منزلِ مقصود تک پہنچنے کی توقع نہیں ہے۔

رہے پیرِ حرم زورِ تمنا کی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوا ہائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی خود نگری کا

نہ ٹھہرنا۔ اور چلتے ہی جانا ؎

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

قرآن کے نزدیک جنت بھی آخری مقام نہیں ہے۔ بلکہ ایک راستہ آگے جانے کے لئے۔

"جنت میں پہنچ کر بھی ان کے ایک پسندیدہ راستہ کی طرف رہنمائی کی جائے گی۔" (۲۲/۲۴)

ثابت ہوا جنت مقام نہیں رہ گذر ہے انسان کو اس سے بھی آگے بڑھتے جانا ہے۔ حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ نے مسلمانانِ ہند کو احساسِ زیاں بخشا اور جس صورِ اسرافیل سے کام لیا محشرستانِ ہند کا ذرہ ذرہ شاہد ہے اور نوجوانانِ ملت کے قلب و دماغ کی صحیح تخلیق و تعمیر میں بھی انتہائی جگر کاوی و جانفشانی سے کام لیا۔ یہی وہ طبقہ تھا جسے انہوں نے اپنے تصورات کی آماجگاہ اپنی امیدوں کا مرکز۔ اپنی تمناؤں کا محور اور قوم کے مستقبل کا مظہر قرار دیا اور اسی لئے اپنے پیغاماتِ خصوصی کا درخورِ تخاطب سمجھا ہے۔ اپنے نوجوانوں کے لئے وہ دعائیں مانگتے تھے۔

جوانوں کو میری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

درد کو اپنے سوز دروں - اپنی تپش و خلش - تڑپ و اضطراب کا وارث سمجھتے تھے - بجنورِ حق طلبی ہوتے -

تیرے آسمانوں کے تاروں کی خیر
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
میرا عشق میری نظر بخش دے

میرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں
میرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
امنگیں میری آرزوئیں میری
امیدیں میری جستجوئیں میری

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
میرے کاسے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

اس راستے کے وہ خوب سمجھتے تھے کہ قوموں کی تعمیر و تخریب میں نوجوان کا کتنا عظیم الشان حصہ ہوا ہے - تاریخ کے اوراق - حضرت انسان کے مشاہدات اور قرآن کے حقائق نے انہیں یقین دلایا تھا -

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن
قدم اٹھا یہ مقام، تمہارے راہ نہیں

علامہ اقبال مغرب کے مادہ پرست تخیل کو معراجِ انسانیت کی راہوں سے آگاہ فرماتے ہیں۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اس روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زماں و مکاں اور بھی ہیں

اللہ تعالےٰ نے صاف طور پر واضح فرمایا ہے۔ یہ بلندیاں جنہیں سمجھ لیا گیا ہے آبادی سے خالی نہیں ہیں۔

"اللہ کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اتنے زمین و آسمان پستیوں اور بلندیوں کو پیدا کیا اور دونوں میں جو جاندار پھیلا دے وہ بھی!" (۴۲/۴۹)

اقبالؒ نے ان آبادیوں کو کارواں کہا ہے ؎

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

زندگی ایک مسلسل خرام کا نام ہے۔ چلتے جانا۔ کہیں نہ رکنا۔ بڑھتے جانا کہیں

تو ان کو سکھ خار و شگافی کے طریقے
مغرب نے سکھایا نہیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کی دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشان نظری کا

حضرت علامہؒ کے نزدیک نوجوانوں کی "پریشان نظری" ان کی غلط تعلیم کا نتیجہ تھی جس سے ان کے دماغ دولتِ یقین سے تہی مایہ۔ ان کی نگاہیں نورِ بصیرت سے محروم۔ ان کے بازو قوتِ عمل سے عاری اور دل تخلیقی مقاصد کے جوہر گرانمایہ سے خالی ہیں۔ نہ ان میں کشمکشِ حیات میں عزم و استقلال سے کام لینے کی صلاحیت ہوئی ہے نہ حقائق کو سمجھنے کی توفیق۔ اسی لئے تو کسی حادثۂ طوفان کی دعا مانگی گئی۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

کون و مکاں

یہ اعلان کہ جو کچھ ہے اُسے انسان کے تابع فرمان رکھا گیا ہے صرف قرآن ہی میں ملے گا۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِيْعًا ۝

"جو کچھ زمین اور آسمانوں کے اندر ہے۔ جو کچھ ان بستیوں اور جنگلوں میں ہے سب کو تمہارے تابع فرمان کر رکھا ہے۔"

کچھ امت حضرت اقبالؒ ان فقیہ دین اور علماء کرام سے اس استفسار میں حق بجانب کرتے کہ عالم وجود سے پہلے انسان کس عالم میں تھا؟ اس لئے کہ اس

زندگی سے اس زندگی کا کوئی تعلق نہیں ہے وہ زندگی تھی اس نہ ختم ہونے والی زندگی کی خاطر۔ جب نہ ختم ہونے والی زندگی کا آغاز ہو گیا تو سب بقہ سلسلہ از خود ختم ہو گیا جس کے کریدنے سے کوئی گوہر مقصود ہاتھ نہیں آسکتا۔ چنانچہ انسان کو حال اور مستقبل پر غور و فکر چاہیئے۔ اس لئے کہ ہماری آج کی دنیا پر اُس کا کچھ زیادہ اثر نہیں پڑتا۔ علامہ فرماتے ہیں ؎

خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

اس کائنات میں انسان کا رُتبہ کس قدر بلند ہے۔ اور اس کی پوزیشن کس قدر قابلِ احترام ہے۔ اسی پوزیشن کا نام خودی ہے جسے سمجھنے کے لئے دنیا اب تک سر پٹک رہی ہے۔ انسان کی فضیلت کے متعلق پہلے پارہ میں ارشاد ہے کہ۔

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً

"میں دنیا میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں"

فرشتے اس ارشادِ الٰہی سے انگشت بہ دنداں ہو جاتے ہیں اور اس آب و گل میں کچھ خون کے چھینٹے اور کچھ آگ کی چنگاریاں دیکھ کر کہتے ہیں کہ اے بارالہ! یہ فتنۂ ارض اس عزت کے قابل نظر نہیں آتا اس اعزاز کے مستحق تو کچھ ہم ہی ہیں کہ

نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ

ہم تیری حمد و ثنا کرتے ہیں اور ہم تیرے ہی حکم کے مطابق کام کرتے ہیں۔"

خدائی فطرت کے چہرے پر تبسم نے گلفشانی کی اور فرمایا کہ ۔

اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۔

"میں جانتا ہوں کہ یہ مضمون موزوں ہو کر کیا معنے ادا کرتا ہے۔"

پھر اللہ نے عظمت آدم کی ایک جھلک دکھائی اور پوچھا کہ اب بتاؤ تم اس کے متعلق کس قدر صحیح جانتے ہو؟ جواب میں عرض کیا کہ بس اُسی قدر جس قدر تک تم نے علم دیا گیا ہے۔ پھر پوچھا کہ کیا یہ امین راز اس قابل ہے کہ نہیں کہ تم اس کے سامنے جھک جاؤ۔ اس پر ملائکہ نے کہا کہ سوائے اعتراف حقیقت کے چارہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ جھکے اور بار بار جھکے کیونکہ اسی مجموعۂ اسرار کی خاطر ہر شے کو زیبائش دی گئی تھی۔ علامہ فرماتے ہیں ۔

نہ آسمان کے لئے ہے نہ آسمان کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

دوسرے معنوں میں نظامِ فطرت کی ہر چیز محض اس خاطر وجود میں لائی گئی ہے کہ انسان اس پر غالب آ کر اس پر حکومت کرے نہ کہ مغلوب ہو کر اس کی اطاعت قبول کرے۔

یہ تمام اشیاء انسان کی ضروریاتِ زندگی کے لئے ہیں۔ مثال کے طور پر انسان پیاس اور پانی سے پانی کا وجود اٹھا دیا گیا ہے اب یہ انسان پیاس کے تڑپ تڑپ کر مر جائے گا۔ لیکن اس کے برعکس پانی کا وجود قائم ہے لیکن روئے زمین پر انسان نہیں ہے تو یہ پانی اس غم میں مر جائے گا کہ

اسے استعمال کرنے والا کوئی نہیں رہا؟ نہیں۔ اس کی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ لیکن محض ایک انسان کے گھر جنم لے لینے سے ان چیزوں کا مختار نہیں بنا جا سکتا بلکہ حاکمیت کا مقام حاصل کرنے کے لئے یقین محکم اور عمل پیہم کی ضرورت ہے۔ جب یہ چیز کسی قوم میں آجائے تو وہ قوم اللہ کا لشکر یا جماعت بن جاتی ہے۔ لیکن افسوس کہ آج مسلمان نے حکومت چھوڑ کر محکومیت اختیار کر رکھی ہے۔ اسی کو خدا نے ذلت کہا ہے اور یہ عذاب ہے جو اپنے اعمالِ بد کی وجہ سے بُلایا جاتا ہے۔ علامہ نے بھٹکے ہوئے انسان کو مخاطب کیا ہے۔

یہی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

حوالہ قرآن۔ "سست نہ ہو اور سست نہ کھاؤ۔ تم تو دنیا میں سب سے بلند ہو بشرطیکہ تم مومن بن جاؤ۔" (۳/۱۳۸)

اسی حقیقت کی دوسری جگہ ترجمانی فرمائی ہے۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

یہ سب چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی مکیں آنی ازلی تیرا بدیہ
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکنات زندگانی کی
جہاں کے جوہر مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

حوالہ قرآن - "اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بہترین قوم بنایا کہ تم تمام لوگوں پر (اعمال کے) نگراں رہو اور تمہارے (اعمال کے) نگراں رسول ہیں" (۲/۱۴۳)

مومن کے مقام کا اب تعین ہو چکا کہ اس کا فرض کیا ہے، کہ یہ تمام دنیا کی قوموں کے اعمال کا جائزہ لیتا رہے کہ کون ٹھیک کام کر رہا ہے، اور کون راستہ سے ہٹ گیا ہے۔ کیونکہ اسے تمام کائنات کا نگراں بنا کر بھیجا گیا ہے۔ یعنی ؎

جہاں کے جوہر مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

جب اللہ تعالیٰ خود قرآن میں آدم (مومن) کی فضیلت کی شہادت دے تو پھر دنیا کی حکومت و ثروت کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے! یہ تو بنی ہی اس کے لئے ہے۔

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

جن حضرات اور بالخصوص ہمارے مولوی حضرات صاحب لولاک سے مراد یہ

وجودِ اقدس و اعظم حضرت محمدؐ لیتے ہیں۔ کیونکہ وہی ایمان و عمل کے مظہرِ اتم تھے لیکن شاید اللہ کا یہ ارشاد ان کی نگاہوں سے اوجھل ہے کہ۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (۲۱/۱۰۵)

"اور یقیناً ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا ہے کہ بے شک یہ تمام زمین ہمارے صالح بندوں کی میراث ہے۔

گویا ہر مومن بطور حق کے اس پر قابض ہوگا اور کوئی اسے اس سے چھین نہیں سکتا۔ کیونکہ یہ وراثت اسے اس مؤسس اعلیٰؐ سے منتقل ہوتی چلی آئی ہے۔ یہ قطرہ ہے لیکن از خود، یک سمندر بھی ہے۔

خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

اور اس کی مثال اس گہرے کنویں کی ہے جس کی گہرائی میں آسمان ایک تارا نظر آتا ہے۔

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

اور کچھ اس خودی کی حفاظت بڑی ضروری ہے۔ ضروریاتِ زندگی کے سودے میں اسے فروخت کر دینا ہی غیر اسلامی طریقِ حیات ہے۔

خودی کے نگہباں کو ہے زہرِ ناب
وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب

دہقاں ہے اس کے لئے ارجمند
رہے جس سے دنیا میں گردن بلند

اس کے بعد اقبالؒ مردِ مومن کو عروج کی راہیں دکھاتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

خودی کی یہ ہے منزلِ اوّلیں
مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

تیرا آسماں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں

خرد نے جسے کہہ دیا ہے زوال تو کیا
طلسمِ زماں و مکاں توڑ کر!

پھر شاہینِ مومن کی تعریف کرتے ہیں۔

خودی شیر مولا جہاں گیر و صید
زمیں اس کی صید آسماں اس کا صید

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود

یہ تو مصنف ہیں جو نگاہیں ہیں یا فکریں ہیں یا فکریں مستور ہیں مصنف
انسان کے تابع فرمان ہیں۔

ہر اک منتظر تیری طلعت کا
تیری شوخی نگہ کا رفتار کا

تو ہے نورِ عالم خوب و زشت
تجھے کیا بتاؤں تری سرنوشت

جب یہ مومن اللہ کی زبان اور فطرت کا ترجمان بن جاتا ہے اور پھر اللہ خود ان بندوں سے ان کی رضا پوچھتا ہے۔ اور پھر یہ بھٹکی ہوئی کائنات اس کے ایک ایک پیغام میں راحت و سکونِ حیات پاتی ہے۔ اس لئے تو علامہ نے مسلمان کو اس بات پر زور دیا ہے کہ اپنی کھوئی ہوئی متاعِ حیات حاصل کرکے پھر اپنے مقام پر آجا۔

سمجھے گا زمانہ تیری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر ترا آدرش یہ کیا ہے

یہ مقام اس وقت حاصل ہوگا جب مسلمان پہلے اپنے پر اثر روشن کرکے اندھیرے کو دور کر دیں۔ اس کے بعد اس کائنات میں اپنا قانون نافذ کر سکیں گے۔ پھر یہ کائنات دلہن بن جائے گی۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

یہ مسئلہ قرآن کا اٹل فیصلہ ہے کہ بغیر قوت کے قانون نافذ نہیں ہو سکتا لیکن قوت کو وجود میں لانے کے لئے اسباب و علل کا وجود لازمی ہے۔ یہ قوت اکثر بعد وجود میں نہیں آتی بلکہ اس قوت کے بعد حکومت وجود میں آتی ہے۔ اور یہ قوت ہمیشہ افراد میں پرورش پاتی ہے کبھی

کے نہ ہونے کا نام افلاس ہے آج ہمارے پاس ایمان نہیں ہے ہم مفلس ہیں۔ ہمارا مرکز نہیں ہے ہم مفلس ہیں۔ ہمارا قانون نہیں ہے ہم مفلس ہیں اور جب یہ چیزیں آجائیں افلاس چلا جاتا ہے۔ اور یہ چیزیں آتی ہیں۔ احساس افلاس کے اس لئے تو علامہ نے فرمایا کہ:۔

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

جس نے اس احساس سے اپنی پوزیشن کا جائزہ نہیں لیا وہ ذلت کی زندگی پر ہے دنیا کبھی اسے عزت نہیں دے سکتی۔

زمانے میں جھوٹا ہے اس کا نگیں
جو اپنی خودی کو پرکھتا نہیں

کلام و کلیم انسان کا وہ نظم خواہ وہ شاعری ہو یا نغمہ دل جس سے سرد رگوں میں زندگی اور حیات زندگی کی حرارت پیدا ہو جائے نہایت قیمتی ہے۔ اور ایسا کلام جو محض ذہنی عیاشی کا ثمرہ ہو قوموں کے لئے بہت بڑی زہر خورانی ہے پانی میں بہتا ہوا تو تریاق بن جاتا ہے۔ جیسا کہ علامہ فرماتے ہیں۔

وقت ہو گر بندت بیداری شب
ورنہ ہے تریاق بھی یہ خاک پر زہر

قرآن حکیم میں گرچہ شاعری یا شعریت کا تذکرہ موجود ہے۔ لیکن رب کائنات

نے لفظ شاعری کے پیش نظر کھلم کھلا اعلان فرمایا ہے کہ یہ کتاب اقتدار ہے شاعری نہیں ہے۔ فرمایا:۔

"اور ہم نے اس (رسول) کو شاعری نہیں سکھائی، ورنہ اس کے شایان شان تھی بلکہ یہ تو ایک (حضرت کے بھلائے ہوئے سبق کی) یاددہانی ہے اور کھلی کھلی قرآن (اور) اس کا کام یہ ہے کہ آگاہ کر دے اور نہ ماننے والوں پر ان کی ہلاکت و بربادی سے پیشتر اتمام حجت ہو جائے۔" (۳۶/۶۹-۷۰)

اس سے ثابت ہوا کہ وہ کلام یا وہ گفتگو جس میں قانون فطرت سے ہٹ کر ذاتی تخیلات اور فیصلے شامل ہوں قابل اعتماد نہیں ہے۔ اور اسی کلام کا نام شاعری ہے جس میں مبالغہ یا دروغ کا امکان موجود ہو ورنہ وہ کلام کلام فطرت ہے۔

اقبال نے شعر کی حقیقت کو یوں بے نقاب کیا ہے۔

میں شعر کے اسرار سے محرم نہیں لیکن
یہ نکتہ ہے تلوار تیغ اصم جس کی ہے تفصیل
وہ شعر کہ پیغام حیات ابدی ہے
یا نغمہ جبریل ہے یا بانگ سرافیل

جو شاعری میں دروغ کا امکان تھا اس کے لئے اللہ نے صاف صاف واضح فرما دی کہ شاعری پیغمبر کے شایان شان نہیں ہے۔ لیکن ایک رسول کا پیغام جس کی تمام طاقتیں اپنے اندر رکھتے کس طرح شعر سے مختلف ہوتا ہے اس کے آگاہ پیغامبر کا سرچشمہ خدا نے حی و قیوم کا علم ازلی ہوتا ہے اس کی آواز

خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ قوموں کی مردہ رگوں اور خاموش روحوں میں خون زندگی دوڑا دے۔ مردوں کی بستی میں صورِ اسرافیل ہو کر رہے۔ یہی خصوصیت ہے جس کے لیے ارشاد ہے کہ:۔

"اے ماننے والو! اللہ اور اس کے رسولؐ کی دعوت پر لبیک کہو جب وہ تمہیں اس چیز کی طرف بلاتا ہے۔ جو تمہیں زندگی بخشتی ہے۔" (۸/۲۴)

اسی دعوت، اسی بلاوے اور اسی آواز کے فراق میں تڑپ کر اقبالؒ نے کہا ہے کہ۔

کہاں تو بے خبر ہے مقتضیٔ سے ہم و زیر سے دل
نہ رہا زندہ و پائندہ تو کیا دل کی کشود
ہے ابھی سینۂ افلاک میں پنہاں وہ نوا
جس کی گرمی سے پگھل جائے ستاروں کا وجود
جس کی تاثیر سے آدم ہو غم و حزن سے پاک
اور پیدا ہو یہ زمیں سے مقامِ محمود
مسجدِ انجم کا یہ صومعہ گردوں بالا نہ رہے
نور ہے اور نہ زنار ہے لا محدود
جس کو مغرب سمجھتے ہیں نقیضانِ خود کو
منتظر ہے کسی مشرب کا ابھی تک وہ سرود

شعر اور قرآن کے اس نمایاں فرق کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ عام شاعروں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ۔

"وہ یوں ہی ادھر اُدھر صحرا نوردیاں اور دشت پیمائیاں کرتے پھرتے ہیں۔ اور اُن کے قول و فعل میں قلب و زبان میں کبھی ہم آہنگی نہیں ہوتی"۔

۲۶
۲۲۵-۲۲۶

فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ مسافر کو اُس راہ کی طرف لے جاتی ہے جو اُس نے اپنے لئے معین کر رکھی ہوتی ہے۔ جس کا کوئی منتہے ہوگا قدم اُسی سمت کی جانب اُٹھے گا اور جس کا کوئی مقصود نہ ہوگا کوئی منزل متعین نہ ہوگی وہ حیوان بے لگام کی مانند جدھر منہ اُٹھائے گا چل دے گا۔ یہ شاعر ایسا بھی کرتے ہیں کہ دل میں کچھ ہوتا ہے اور زبان سے کچھ اور ادا ہو رہا ہوتا ہے۔ یا کہنا کچھ چاہتے ہیں لیکن قیود و حدود شاعری میں مقید ہو کر نہیں کہہ سکتے اور فطرت کے خلاف کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور وہ کبھی حسین و جمیل وادی میں ہیں تو کبھی بھیانک صحرا میں۔ مقصد صرف پیش نظر گرمی سخن ہوتا ہے اور بس۔

اس کے برعکس ایک شخص کے سامنے زندگی کا ایک خاص مقصد ہے اور وہ مقصد بھی اپنا متعین کردہ نہیں بلکہ وہ جو قرآن نے متعین کیا ہے جس پر اس کا ایمان ہے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے قلب و دماغ، اپنے افکار و جذبات کو اس کے تابع رکھے جس پر اُس

کی زبان ہو۔ وہ سوچے تو اُس کے فہم سے۔ وہ سمجھے تو اُس کے اشارے سے۔ وہ دیکھے تو اُس کی آنکھ سے۔ وہ قبول کرے تو اُس کے حکم اور منشا کے ماتحت۔ وہ رد کرے تو اُس کی مرضی کے مطابق۔ اب کوئی انسان اگر اپنے خیالات زبانِ شعر سے ادا کرے تو یہ شعر اُس زمرے میں آجائے گا جس کے متعلق قرآن نے فرمایا ہے کہ۔

"مگر وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں۔ اعمال صالح کرتے ہیں اور اللہ کو بہت یاد کرتے ہیں اور اپنے اُس وقت کرتے ہیں جب اُن پر زیادتی کی گئی ہو۔" (۲۶/۲۲۷)

اقبال نے شعر کی شان یہ بتائی ہے ؎

نہ میرے ذکر میں ہے صوفیوں کا سوز و سرود
نہ میرے شعر میں ہے پیچ و تاب ثواب و عذاب
خدا کرے کہ اسے اعتقاد ہو مجھ سے
کہ میں ہوں محرمِ حرفِ صداقت و کتاب
اگر نہ ہو یہ پوشیدہ موت کا پیغام
حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب

اقبال بھی قرآن کی نگاہ میں اسی زمرے میں شامل ہے کیونکہ وہ شعر میں قرآن فہمی کی جن بلندیوں پر پہنچ چکا تھا، اُن کی رو سے بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ نامۂ اسلام نے اس سے پہلے کوئی ایسا شاعر پیدا

نہیں کیا۔

اگر یہ درست ہے کہ کسی شاعر کے کلام کو سمجھنے سے پہلے اُس کے جذبات و خیالات تک پہنچنا ضروری ہوتا ہے جن پر اس کی شاعری کی اساس ہے اور اس مرکز سے واقفیت حاصل کی جو اُس کی شاعری کا نقطہ پرکار ہے تو بلا تکلف کہا جا سکتا ہے کہ اقبالؒ کا کلام کما حقہٗ سمجھ میں نہیں آسکتا جبتک قرآن کریم نگاہوں کے سامنے نہ ہو۔ جو اس نظر سے پیغامِ اقبالؒ کو دیکھے گا یا سُنے گا وہ جہاں ایک طرف یہ محسوس کرے گا کہ قرآنِ کریم انسان کو کن بلندیوں تک اُڑا کر لے جاتا ہے دوسری طرف یہ بھی دیکھ لے گا کہ اقبالؒ قرآنِ کریم کے اہم حقائق اور مسائل کو کس خوبی اور سلاست کے ساتھ ایک شعر میں حل کر کے رکھ دیتے ہیں۔ میں نے بھی ایک مرحلہ تک اقبالؒ کو ایک شاعر کی حیثیت سے ہی دیکھا ہے۔ اُس پر تنقید کی ہے۔ اُسے غلط سمجھا ہے۔ اُس کی شاعری کو معیارِ شاعری پر پرکھنے کی سعی کی ہے۔ اور پھر کلام سے صرف شاعری کی لطف حاصل کیا ہے لیکن جب یہ حقیقت سامنے آگئی کہ کلامِ اقبال کا سرچشمہ کیا ہے تو اس کے بعد اُن کی شاعری کی نوعیت ہی بدل گئی۔ اور پھر سمجھ میں آیا کہ اقبال کیا کہہ گئے ہیں۔ اور یہ راز بھی کھل گیا کہ کون سی شاعری ہے جس سے متعلق قرآن نے فرمایا ہے کہ اس کا اتباع راہ گم کردہ لوگ ہی کرتے ہیں۔

"اور وہ کون سی شمع ہے جو اُس منزلِ مقصود کے لئے
چراغِ راہ کا کام دیتی ہے۔ جس کی طرف صراطِ مستقیم

لے جاتا ہے" ۵ ۴۶/۲۲۴

علامہ اُس جذبات کے فوارہ کی طرف اشارہ فرما کر کہتے ہیں کہ ۔

یہ آبجو کی روانی یہ ہمکناریِ خاک
مری نگاہ میں نا خوب ہے یہ نظّارہ
اِدھر نہ دیکھ اُدھر دیکھ اے جوانِ عزیز
بلند زورِ دروں سے جواب ہے فوّارہ

اور پھر شاعر سے مخاطب ہوتے ہیں ۔

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاجِ نفس نے
ست عرب تیرے سینہ میں نفس ہے کہ نہیں ہے
تاثیر غلامی میں خودی جس کی ہوئی نرم
قابل نہیں، اُس قوم کے حق میں عجمی مے
شیشے کی صُراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو
شمشیر کی، سنگ ہو تیزی میں تری مے
ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے
بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تختِ جم و کے

قبلہ اُس پیغام کی تشریح میں سرگرداں ہے جسے حضرت بلال نے
اُن روحوں سے سنا اور اُس نوا کا منتظر ہے جو بلال رضؓ کی زبان سے نکلی اور
دلوں کا سینہ چیر گئی ۔ اقبال نے اپنی شاعری کو ذریعہ بنایا ہے

پیامِ الٰہی کے دُہرانے کا۔ اقبال کی شاعری بھولا ہوا سبق یاد دلاتی ہے ورنہ اقبال عام شاعر سے گریز کرتا ہے۔

ہے شعرِ عجم گرچہ طرب ناک و دلآویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز
افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں
بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحر خیز
وہ ضرب اگر کوہ شکن بھی ہو تو کیا ہے
جس سے نہ لرزاں ہوئی دولتِ پرویز

اقبال فہمی اور قرآن فہمی کے اس اسلوب کی طرف میری رہ نمائی کرنے میں جن گرانمایہ ہستیوں کے بارِ احسان سے میری گردن ہمیشہ نگوں سار رہے گی اُن میں حضرت علامہؒ کی ذاتِ گرامی اور حضرت علامہ پرویز مصنفِ معارف القرآن کی محترم شخصیت ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے معارف القرآن کا مطالعہ یقیناً ہمیں اور ہماری نسلوں کو اسلام کی اس زندگی میں داخل کر دے گا جس کے لئے علامہ بے قرار رہے اور جس کا مطالبہ خود قرآن نے کیا ہے۔ بارہا ایسا ہوا کہ قرآنِ کریم کے سمجھنے میں مشکل آ گئی تو حضرت اقبالؒ کے ایک شعر نے رہ نمائی فرما دی اور مجھے اس کی تیز روشنی میں راستہ دکھائی دینے لگا۔ اس کے علاوہ میں نے "طلوعِ اسلام" کے سمندر سے چند قطرے لے کر تشنگیِ ذوق کی تسکین کے سامان فراہم کئے

اور میں فخر کرتا ہوں کہ ایک چراغ ہے بلکہ سرچ لائٹ جس کی روشنی میں بھولے بھٹکے راستہ حاصل کرتے ہیں۔ طلوعِ اسلام اور اقبال کا مسلک ایک ہے۔ حضرت اقبال نے مذہب کو ایسے انداز میں پیش کیا ہے کہ اس کی روح پھر سے ان کے خون کے ذرّوں میں جذب ہو گئی۔ اور اس طرح وہ غیر محسوس طور پر قرآن کریم کے قریب لا کر کھڑے کر دیے گئے۔ ہمارا وہ طبقہ جو مذہب سے متنفر ہو چکا تھا کلامِ اقبال کے عشق سے وہ پھر محبوب ہو گیا ہے۔ اس کا ذوق پھر غور و فکر کی طرف مائل کر رہا ہے۔

اس قدر کام تو حضرت علامہ نے سرانجام دیا کہ وہ نوجوان طبقہ کو غیر محسوس طور پر دعوی کے خشک انداز سے انگ اسلوب میں قرآن کریم کے بہت قریب لا کر کھڑا کر دیا۔ اب یہ کام باقی ہے کہ انھیں یہ بتایا جائے کہ حضرت علامہ نے جو کچھ کہا ہے وہ قرآن کریم ہی کی ترجمانی ہے جز اس کے جو صرف انسانی تقاضوں کے تحت صرف شاعری ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر میں نے اللہ کے تعاونِ خفی کو پکارا۔ اور اس کا سہارا لے کر یہ کتاب شروع کی۔ اس کے بعد جو اللہ کو منظور ہے میں نے اس ہنر سے گریز کیا ہے جس کے متعلق علامہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کے اندیشہ کا ریشم ہیں قوموں کے مزار
چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند
کرتے ہیں روحِ تن خوابیدہ کو بیدار

نکات ۵۵ دنیا کے دیگر مذاہب کا منتہائے فکر یہ ہے کہ انسان کو اس کی اپنی نجات کا طریقہ سکھائیں۔ اُسے بتائیں کہ اُسے مکتی کیسے مل سکتی ہے اور وہ سیلویشن کس طرح حاصل کر سکتا ہے۔ اُسے سکھایا جاتا ہے کہ انسان دنیا کے دھندوں سے الگ ہو کر گاؤ۔ خدا۔ یا ایشور کی بھگتی کرے یا عبادت میں مگن ہو جائے۔ ان مذاہب میں خدا کے قریب وہی سمجھا جاتا ہے جو اُس کے بندوں سے دور ہوتا چلا جائے۔ گرہست آشرم اور سنیاس آشرم ایک انسان کی دو مختلف زندگیوں کے نام ہیں جو کبھی یکجا نہیں ہو سکتے۔ کلیسا کا راہب بیوی بچوں کی زندگی سے دور بھاگتا ہے کہ ان میں اسے شیطان کی روح نظر آتی ہے۔ سلطنت اور مذہب نظامِ عالم کے دو جداگانہ شعبے ہیں۔ جن میں کبھی تطابق و توافق پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے برعکس اسلام دنیا کو ایک اور ہی سبق دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ مذہب انسان کی عملی زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے۔ اس کے حدود و قیود وہ پختہ ساحل ہیں جو حیاتِ انسانی کی جوئے رواں کا رخ متعین کرتے ہیں۔ اسلام کے نزدیک مذہب کا منشا محض ایک انسان کی انفرادی نجات ہی نہیں بلکہ اس مقصد یہ ہے کہ خدا کی اس وسیع زمین پر جسے انسان کی ہوس پرستیوں نے جہنم بنا رکھا ہے۔ اللہ کی حکومت قائم کی جائے۔ اس نظامِ زندگی اور ضابطۂ حیات کا نام اسلام ہے۔

ظاہر ہے کہ اس حکومتِ الٰہیہ کے قیام و بقا کے لئے اللہ کے سپاہیوں کی جماعت کی ضرورت پڑے گی۔ اس جماعت کا نام ہے "حزب اللہ" جو دنیا میں اپنے لئے نہیں بلکہ اپنے خدا کے لئے جیتی ہے۔

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں تیرا نام ہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ ہو جام ہے

مگر ستم یہ ہوا کہ اسلام کی اس امتیازی تعلیم پر غیر اسلامی تصورات اس درجہ غالب آ گئے کہ حیاتِ اجتماعیہ کا یہ نظریہ مسلمانوں کی نگاہوں سے یکسر اوجھل ہو گیا۔ دوسرے مذاہب کی طرح اسلام کے متعلق بھی یہی سمجھ لیا گیا کہ اس کا مقصد انسان کی انفرادی نجات ہے۔ اگرچہ یہ غلط نظریہ مسلمانوں کے ذہن پر ایک عرصہ سے مسلط تھا۔ لیکن دورِ حاضرہ میں ان لوگوں کی طرز نما سے جو یہ سمجھتے تھے کہ اسلام کا یہ مذہبی نشان ہے۔ ان کے بعض مخصوص مقاصد کی رو میں یک سنگِ گراں بن کر حائل ہے۔ اس نظریہ کو بڑا نمایاں کر کے دکھایا گیا ہے اور ہر جگہ اس کا اعلان کیا گیا ہے کہ مذہب انسان کے پرائیویٹ عقیدہ کا نام ہے۔ اس کی زندگی میں اس کا کوئی دخل اور تعلق نہیں ہونا چاہئے۔ ایسے پُرآشوب زمانہ میں جبکہ مذہب کے متعلق غیروں اور بیگانوں کی طرف سے اس قسم کے غیر اسلامی تصورات کو عام کیا جا رہا تھا۔ حضرت علامہ کی خوش بختی سے ان کے اندر ایک مردِ صاحبِ بصیرت پیدا ہوا۔ جس نے بصیرتِ قرآنی اور جرأتِ ایمانی کے ساتھ ان کے اس گمگشتہ نظریہ پھر سے نمایاں کیا اور اعلان کیا کہ:-

فردِ قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

مدعیوں نے کہا کہ یہ غلط ہے بلکہ زوال کا سبب یہ ہے کہ ہم سب مرا بیٹھے

پوری کی پوری قوم افلاس کے جامے میں پھنسی ہوئی ہے لیکن اس مردِ خدا نے کہا

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوالِ بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

جب تک طریقۂ تعلیم اور نصابِ تعلیم نہ بدلیں گے ہماری نگاہوں کے زاویے نہیں بدل سکتے علامہ نے بھی اسی حقیقت پر زور دیا ہے کہ:۔

چمن میں تربیتِ غنچہ ہو نہیں سکتی
نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریکِ نسیم

چونکہ انگریز نے ہمیں ہماری تعلیم سے بہت دور کر دیا اور حاکمانہ حیثیت سے اپنی تہذیب ہم پر ٹھونس دی جس کے قبول کر لینے پر ہم مجبور تھے نتیجہ یہ ہوا کہ ہم خود سے بیگانہ ہو گئے۔ علامہ نے ملت کے نوجوان طبقہ کو اسی حالت میں دیکھ کر کہا۔

تیرا وجود سراپا تجلیِ فرنگ
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر

مغرب کے فلسفہ گمتی کی زد سے مشرق کا ذہن محفوظ نہ رہ سکا مغرب کا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح سے مسلمان "مسلم" نہ رہے اور اس نے اپنی کامیابی کے لئے اسلامی درسگاہوں کے نظام و نصاب کو بدل دیا اور وہ واقعی کامیاب ہو گیا۔ اور ہمیں ایسا علم دیا جس سے شرافت کا علم ختم ہو گیا

یہ حکمتِ ملکوتی یہ علمِ لاہوتی!
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کیا بھی نہیں

یہ عقل و ہوس دیپروں کا کھیلتی ہے شکار
شریکِ شورشِ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
زباں نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اس تعلیم نے ہمیں منتشر کر دیا ہے وہ یکجہتی نہیں رہی۔ وہ رابطہ نہیں وہ مرکزیت نہیں۔ فرد اور ملت کی مثال ایک گھڑی کے پرزوں کی سی ہے۔ پرزے الگ بکھرے پڑے ہوں تو ایک ایک پرزہ کتنا ہی قیمتی اور کیسا ہی مضبوط کیوں نہ ہو کسی کام کا نہیں۔ لیکن اگر یہی پرزے ایک خاص نظام کے ماتحت گھڑی کے اندر فٹ کر دیئے جائیں تو ہر پرزہ کی حرکت ساری مشینری پر اثر کرے گی اور پرزوں کی حرکات کے نتائج آنکھوں کے سامنے آجائیں گے۔ علامہ نے بھی یہی فرمایا ہے کہ یہ پرزے گئے تو اسلام بھی گیا۔

اپنی ملت پہ قائم تھا تو جمعیت بھی تھی
چھوڑ کر گل کو پریشاں کا رو بن بو ہوا
چھپ کہیں سے اس کو پیدا کر بڑی دولت ہے یہ
زندگی کیسی جو دل بیگانۂ پہلو ہوا
آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی
جب یہ جمعیت گئی دنیا میں رسوا تو ہوا

ان کے نزدیک مسلم کی تعریف ہی یہی ہے کہ وہ قطرہ کی طرح فنا ہو کر ملت کے

سمندر میں جذب ہو جائے اور یوں بقائے دوام کے بلند مقام پر سرفراز ہو جائے۔ علامہ اقبال اَنَا الْمِلَّتْ کا نعرہ لگانا سکھاتے ہیں "نبی اکرم نے فرمایا کہ تمام روئے زمین کے مسلمانوں کی مثال ایک جسدِ واحد کی سی ہے" گرتے ہوئے صحرا میں کشتی حبشی کے تلوے میں آبلہ پڑ جائے گل کدۂ ایران میں ریشمی بستر پر لیٹے ہوئے شہنشاہ کی نیند حرام ہو جائے۔ یک ایک انسان اپنے آپ کو پوری کی پوری ملت سمجھے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے

"یقیناً ابراہیم (علیہ السلام) ایک فردِ واحد نہیں تھا بلکہ ایک (پوری کی پوری) ملتِ قائمہ کو اپنی ذات میں سموئے ہوئے تھا۔ وہ تمام دنیا سے کٹ کر سیدھا اسی کے راستہ پر قائم تھا۔"

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ:

بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

وہ مسلمان سے کہتے ہیں کہ تو نے اپنے مقام کو پہچانا ہی نہیں اور یونانی تہذیب مغرب کی جھوٹی چمک تجھے پسند آ گئی حالانکہ اگر کبھی تو اپنے آپ سے آگاہ ہو جاتا اور محسوس کر لیتا کہ:

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن
قدم اٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں

حضرت علیؓ کا قول ہے:

"جمعیت تفرقہ سے بچو۔ یاد رکھو کہ جو شخص قوم سے کٹ کر
تنہا رہ جاتا ہے وہ کسی طرح مستِ جان کا شکار ہو جاتا
ہے جس طرح ایک بھیڑ گلے سے جدا ہو کر بھیڑیے کا شکار
ہو جاتی ہے۔ دیکھو جو شخص تمہیں اس شعار کی طرف دعوت
دے اُس کو قتل کر دو، خواہ وہ سر میرے ہی عمامہ کے نیچے
کیوں نہ ہو۔"

علامہ فرماتے ہیں ؎

جدا سے تو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے نوعِ انساں کو
اخوت کا مسیحا ہو جا محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اُڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

نبی اکرم نے فرمایا:

جو شخص جماعت سے الگ ہو کر جماعت سے الگ ہوا
[illegible]

[illegible]

[illegible] باتوں کا [illegible] ہوں جن کو اللہ نے [illegible]

دیا ہے۔ اوّل۔ جماعت کے ساتھ رہو۔ دوم۔ حکم امیر سنو
سوم۔ امیر کی طاعت کرو۔ چہارم۔ ضرورت پڑے تو
اپنی عزیز ترین چیزوں کو حق کے لئے چھوڑ دو۔ پنجم۔ اللہ
کے راستے میں جہاد کے لئے نکل آؤ۔ یاد رکھو جو شخص جماعت
سے ایک بالشت بھر بھی الگ ہو گیا تو اسلام کا نشان
اُس کے گلے سے اُتر گیا۔"

سوال کیا گیا کہ یا رسول اللہ۔ خواہ وہ روزے رکھتا ہو اور
نمازیں پڑھتا ہو؟ فرمایا ہاں وہ جماعت سے الگ ہو کر
اسلام سے خارج ہو جائے گا۔

اس لئے کہ۔

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو
نا آشنا ہے قاعدۂ روزگار سے

ملّت کے ساتھ وابستہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

جب تک ہم دینِ مصطفوی کو از سرِ نو زندہ نہ کریں گے۔ اپنے بھولے
ہوئے سبق کو نہ دہرائیں گے قرآن کریم کو مودی اور انگریز کے نظریہ سے الگ
ہو کر قبلہ نما سے نہ دیکھیں گے ہم اپنے آپ کو نہ پہچان سکیں گے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم

قرآن کو صرف اس لئے پڑھیں کہ وہ ہمیں زندگی بسر کرنے کے طریقے سکھاتا ہے۔ پھر وہ طریقے سیکھیں اور آہستہ آہستہ عمل کرتے جائیں اور غیروں کی تہذیب کو دفن کرتے چلے جائیں۔ ایک دن آئے گا کہ یہی سائنس ہمیں قرآن کے اندر نظر آئے گی صرف انکشاف کی ضرورت ہے۔ ہم سائنس کو علم قرآن کا جزو بنیں تو مناسب ہے۔ انگریز جس نے ہمیں قرآن سے ہٹا کر مادہ پرستی کی طرف مائل کیا خود پریشانیوں سے نجات حاصل نہ کر سکا۔ اسی مشکل میں پھنسے ہوئے انگریز کے متعلق اقبالؒ نے فرمایا ہے۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

علامہ اقبال نے مغرب کی انتہائے تہذیب کو مبدء گر کہا ہے اس لئے کہ جب باطل اپنے دعووں کی بنیادوں پر اس قدر اونچا چلا جاتا ہے جہاں سے گر کر رہنا ہوتا ہے اسے کچھ نہیں سوجھتا کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا تو وہ اپنے علم کو نہایت ہی کمزور محسوس کرتا ہے گویا ٹھیک اس وقت اس کا مذہب دعووں کی تردید کرتا ہے اور ٹھیک اس وقت اس کے غلط دلائل کا جنازہ

اُٹھتا ہے اور اُس کے تصورات کی میت لبِ گور ہوتی ہے ۔

زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر
یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور

ایک حسین طنز ملاحظہ ہو :۔

نئی بجلی کہاں اُن بادلوں کے جیب و دامن میں
پُرانی بجلیوں سے بھی ہے جن کی آستیں خالی

قومیت کا مفہوم دنیا میں قومیں اشتراکِ وطن ۔ اشتراکِ نسل اور اشتراکِ زبان وغیرہ کی اساس پر بنتی ہیں ۔ وہ پارٹیاں کہلاتی ہیں ۔ مثلاً انگریزوں کی ایک قوم ہے جو اصول و مسلک کے اشتراک سے قائم نہیں ہوئی لیکن اس قوم کے اندر اشتراکِ اصول کے ماتحت لبرل اور لیبر وغیرہ پارٹیاں بنتی رہتی ہیں ۔ اسلامی قومیت میں وجہ جامعیت وطن ۔ نسل ۔ رنگ اور زبان وغیرہ نہیں ۔ بلکہ اصول مسلک ہے یعنی وہ وجہ جامعیت جس کی بنا پر آج قومیں نہیں بلکہ پارٹیاں بنتی ہیں ۔ اس لئے دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں اس اصول ترتیب کی جہت سے مسلمان حزب یعنی پارٹی ہیں ۔ گویا اسلامی قومیت خاک و خون کی حدود سے بلند اصول و مسلک کے اشتراک کی بنا پر قائم ہوئی ہے ۔ اشتراکِ وطن کے نظریہ کو بے نقاب کرتے ہوئے علامہ نے فرمایا ہے کہ ۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

جن افراد میں اصول و مسلک کا اشتراک مشترک ہو وہ اس قوم کے افراد ہیں جو اس اصول سے منہ پھیریں وہ مردم شماری کے رجسٹر میں اپنا نام خواہ کچھ ہی کیوں نہ لکھوائیں مسلم قومیت کے افراد نہیں کہلا سکتے۔ حضرت علامہؒ نے مسلم قوم کے افراد کو مخاطب فرمایا ہے۔

یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے

ہماری آج کی زندگی قطعی اس قابل نہیں کہ ہم رات کو سوئیں اور صبح اٹھیں تو ہم میں سے ہر ایک عمر فاروقؓ بنا ہوا ہو۔ چنانچہ ہمیں اسلامی زندگی اپنانے کے لئے ایک مدت درکار ہے۔ لیکن اس درمیانی وقفہ میں اگر یہ صورت رہی کہ ہم جو قدم اٹھائیں وہ اسلام کی طرف اٹھائیں تو اس مدت تک یہ جاہلیت کی منزل طے ہو جائے گی اور اگر یہی فیصلہ کر کے بیٹھ جائیں کہ یہ کام ایک دن کا نہیں ہے اسے دو برسوں پر اور رکھئے وہ برسوں کے بعد کا دن آپ کی زندگی میں کبھی نہیں آئے گا۔ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دن آپ کی زندگی میں آ جائے یا کم از کم آپ کے بعد آپ کی نسلوں کی ابتدا اس دن سے ہو تو فیصلہ کر لیجئے کہ ہم اپنے اندر ایک مدت دراز سے کہ جا اچھا قدم اٹھے تہذیب اسلامی کی جانب اٹھے۔ یہ ایک

ایک قدم پوری منزل کاٹ کر رکھ دے گا کیونکہ ہم تباہی کی طرف بھی اسی طرح اسی رفتار سے آئے تھے وہ راستہ بھی برسوں کے بعد ختم ہوا تھا۔ اب ہمیں دوسری منزل کی طرف قدم اُٹھانا ہے تو یہ راستہ بھی برسوں کی مسافت کے بعد طے ہوگا۔ سب سے پہلے ہمیں وطن کی حقیقت کو سمجھنا ہوگا۔ وہ اس لئے کہ اتفاق سے یا بدقسمتی سے ہم آج ایک ایسے دَور سے گزر رہے ہیں جس میں وطن کا بُت سب سے زیادہ عزیز نظر آ رہا ہے۔ ہم ہجرت کر کے ترکِ وطن کر چکے ہیں اور ہم اُنہی اینٹ پتھر کی عمارتوں کو رو رہے ہیں اور اس زمین کو قطعی اجنبی خیال کرتے ہیں۔ حضرت اقبالؒ قرآن کی روشنی میں بتاتے ہیں کہ۔

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
وہ بحر میں آزاد وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سُنّتِ محبوبِ الٰہی
دے تو بھی نبوّت کی صداقت پہ گواہی

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوّت میں وطن اور ہی کچھ ہے

لفظ قوم اور اس کے ہم معنی انگریزی لفظ نیشن یہ دونوں دراصل جاہلیت کی اصطلاحیں ہیں۔ جاہلیت نے "قومیت" کو کبھی خالص تہذیبی بنیاد پر قائم نہیں کیا۔ قدیم جاہلیت کے دور میں اور جدید جاہلیت کے دور میں ان کے دل و دماغ کے ریشوں میں نسلی اور روایتی علائق کی بہت کچھ اس طرح پلا دی گئی ہے

کہ وہ نسلی روابط اور تاریخی روایت کی وابستگی سے قومیت کے تصور کو کبھی پاک نہ کر سکے جس طرح قدیم عرب میں قوم کا لفظ عموماً ایک نسل یا ایک قبیلہ کے لوگوں پر بولا جاتا تھا اسی طرح آج بھی لفظ نیشن کے مفہوم میں مشترک جنسیت کا تصور لازمی طور پر شامل ہے اور یہ چیز چونکہ بنیادی طور پر اسلامی تصور اجتماع کے خلاف ہے اس وجہ سے قرآن میں لفظِ قوم اور اس کے ہم معنی دوسرے لفظ مثلاً شعب وغیرہ کو مسلمانوں کی جماعت کے لئے اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی اصطلاح اس جماعت کے لئے کیونکر استعمال کی جا سکتی تھی جس کے اجتماع کی اساس میں خاک و خون اور رنگ و نسل اور اس نوع کی دوسری چیزوں کا قطعاً کوئی دخل نہ تھا جس کی تالیف و ترکیب محض اصول اور ملک کی بنیاد پر کی گئی تھی۔ اور جس کا آغاز ہی ہجرت اور قطع نسب اور ترک علائق مادی سے ہوا تھا۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

قوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

قرآن نے جو لفظ مسلمانوں کی جماعت کے لئے استعمال کیا ہے وہ حزب ہے جس کے معنی پارٹی کے ہیں۔ قومیں نسب و نسل کی بنیاد پر استوار ہوتی ہیں

اور پارٹیاں اصول و مسلک کی بنیاد پر۔ اس لحاظ سے مسلمان حقیقت میں قوم نہیں بلکہ ایک پارٹی ہیں۔ جماعت ہیں۔ کیونکہ اُن کو تمام دنیا سے الگ اور ایک دوسرے سے وابستہ صرف اس بنا پر کیا گیا ہے کہ یہ ایک اصول اور مسلک کے معتقد اور پیرو ہیں۔ اور جن سے ان کا اصول و مسلک میں اشتراک نہیں وہ خواہ ان سے قریب ترین مادی رشتے ہی کیوں نہ رکھتے ہوں ان کے ساتھ ان کا کوئی میل نہیں ہے۔ قرآن روئے زمین کی اس پوری آبادی میں صرف دو ہی پارٹیاں دیکھتا ہے ایک اللہ کی جماعت (حزب اللہ) دوسری شیطان کی پارٹی (حزب الشیطان) شیطان کی پارٹی میں خواہ باہم اصول اور مسلک کے اعتبار سے کتنے ہی اختلاف کیوں نہ ہوں قرآن ان سب کو ایک جتھا ہے کیونکہ ان کا طریق فکر اور طریق عمل بہرحال اسلام نہیں ہے اور جزئی اختلافات کے باوجود بہرحال وہ سب شیطان کے اتباع پر متفق ہیں۔ قرآن کہتا ہے۔

"شیطان ان پر غالب آیا اور اس نے خدا سے انہیں غافل کر دیا وہ شیطان کی پارٹی کے لوگ ہیں اور جان لو کہ شیطان کی پارٹی آخر کار نامراد رہنے والی ہے۔"

علامہ فرماتے ہیں:۔

ہے ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بٹ گئی

بنی آخر دینی جمعیت سے علیحدہ ہونے کے بعد دوسری یعنی شیطان کی پارٹی میں شامل ہو جاتا ہے جو حزب اللہ نہیں ہے اسی لئے تاکید کی ہے کہ ؎

ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

شیطان کی پارٹی والے خواہ نسل، وطن اور زبان اور تاریخی روایات کے لحاظ سے باہم کتنے ہی مختلف ہوں بلکہ ہو سکتے ہیں ان کے آباؤ اجداد میں باہم خونی عداوتیں ہی کیوں نہ ہوں جب وہ خدا کے بتائے ہوئے طریق اور متعین کردہ اصول و مسلک حیات میں متفق ہو گئے تو گویا الٰہی رشتے (حبل اللہ) سے باہم ایک ہو گئے اور اس نئی پارٹی (حزب اللہ) میں داخل ہوتے ہی ان کے تمام تعلقات حزب الشیطان والوں سے کٹ گئے۔

پارٹی کا یہ اختلاف باپ اور بیٹے تک کا تعلق توڑ دیتا ہے حتیٰ کہ باپ بیٹے کی وراثت تک نہیں پا سکتا۔ کیونکہ یہ دو مختلف ملتوں کے لوگ ہیں ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔

پارٹی کا یہ اختلاف بیوی کو شوہر سے جدا کر دیتا ہے حتیٰ کہ اختلاف رائے ہوتے ہی دونوں پر ایک دوسرے کی مواصلت حرام ہو جاتی ہے۔ [illegible] دونوں کی زندگی کے راستے جدا ہو جاتے ہیں۔ قرآن میں ہے۔ [illegible]

پارٹی کا یہ اختلاف ایک برادری ایک خاندان کے آدمیوں میں پورا مشرقی مقاطعہ کرا دیتا ہے حتیٰ کہ ایک دوسرے میں شادی بیاہ کرنا حرام ہو جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ :-

"مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو" "مومن لونڈی مشرک خاتون سے بہتر ہے۔ خواہ وہ تمھیں کتنی ہی پسند ہو۔ اور اپنی عورتوں کے نکاح بھی مشرک مردوں سے نہ کرو۔ جب تک کہ دونوں ایمان نہ لائیں۔ مومن غلام مشرک عزت دار سے بہتر ہے چاہے وہ تمھیں کتنا ہی پسند ہو۔"

پارٹی کا یہ اختلاف نسلی و وطنی قومیت کا تعلق صرف کاٹ ہی نہیں دیتا بلکہ دونوں میں ایک مستقل نزاع قائم کر دیتا ہے تاوقتیکہ وہ اللہ کی پارٹی کے اصول نہ مان لیں۔ قرآن کہتا ہے :-

"تمھارے لئے بہترین نمونہ ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں ہے۔ ان لوگوں نے اپنی قوم والوں سے صاف کہہ دیا تھا کہ ہمارا تم سے اور تمھارے ان معبودوں سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر بندگی کرتے ہو کوئی واسطہ نہیں۔ ہم تم سے بے تعلق ہو چکے اور ہمارے تمھارے درمیان ہمیشہ کے لئے عداوت پڑ گئی تاوقتیکہ تم خدائے واحد پر ایمان لاؤ مگر تمھارے ابراہیم کے اسی قول میں نمونہ نہیں ہے کہ اس نے اپنے باپ سے کہا کہ میں تیرے لئے بخشش کی دعا

کردوں گا۔" (سورۂ ممتحنہ۔ رکوع اوّل)

لیکن جب ابراہیمؑ کو معلوم ہو گیا کہ اس کا باپ خدا کا پکا دشمن ہے تو وہ دعا کے لئے دست بردار ہو گیا۔" (سورہ توبہ، رکوع ۱۴)

دوسرا لفظ جو پارٹی کے معنی میں قرآن نے مسلمانوں کے لئے استعمال کیا ہے وہ لفظ "اُمّت" ہے۔ اُمت اس جماعت کو کہتے ہیں جس کو کسی امرِ جامع نے جمع کیا ہو۔ افراد کے درمیان کی اصلِ مشترک ہونی چاہیئے جس کی بنا پر انھیں ایک اُمت کہا جا سکے۔ مسلمانوں کو جس اصلِ مشترک کی بنا پر اُمت کہا گیا ہے وہ نسل وطن۔ رنگ۔ زبان یا معاشی اغراض نہیں ہیں۔ بلکہ وہ ان کی زندگی کا نصب العین اور ان کی پارٹی کا اصول اور ان کی جماعت کا مسلک ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے۔

"تم وہ بہترین اُمت ہو جسے نوعِ انسانی کے لئے نکالا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو بدی سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔" (سورۂ آلِ عمران۔ رکوع ۱۲)

اس سے ظاہر ہوا کہ مسلمان ایک بین الاقوامی جماعت کا نام ہے۔ دنیا کی ساری قوموں میں سے ان اشخاص کو چن کر نکالا گیا ہے جو ایک خاص مشن کو انجام دینے کے لئے زندہ ہیں۔ قرآن نے اس پارٹی کے مقصد کو کہا ہے کہ "تم نوعِ انسانی پر گواہ ہو۔" اس فقرہ سے ظاہر ہے کہ مسلمان کا مشن عالمگیر مشن ہے۔ اس کا ہدف یہ ہے کہ قرآن کے قانون کو زمین کے چپہ چپہ پر نافذ کرے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جس کی بنا پر اسے اُمت کہا گیا ہے۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا اس حقیقت کو بھولتے چلے گئے کہ وہ دراصل ایک پارٹی

اور اسی اساس کی بنیاد پر ان کی قومیت کی بنیاد ہے یہ بھلا وہ بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ پارٹی کا تصور قومیت کے تصور میں بالکل گم ہو گیا ہے مسلمان اب صرف ایک "قوم" بن کر رہ گئے ہیں جیسا کہ جرمن ایک قوم ہے۔ جاپان ایک قوم ہے۔ لیکن وہ بھول گئے ہیں کہ اصل چیز وہ مسلک ہے جس پر اسلام نے ان کو ایک امت بنایا تھا۔ افسوس کہ مسلمان نے دوسروں سے قومیت کا غلط تصور لے کر اصل چیز کو اپنے اندر سے ضائع کر دیا ہے۔

پارٹی سے انحراف کی سزا قتل ہے لیکن قوم سے انحراف کی سزا صرف علیحدگی ہے۔ کیا آج روئے زمین پر اسلامی سوسائٹی موجود ہے؟ — نہیں۔ پھر ہم کس بنا پر اپنے اندر اسلامی ہمدردی اور رواداری کو بیدار کرتے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم سوسائٹی سے باہر ہو کر سوسائٹی کے افراد سے ہمدردی کا سلوک کریں۔ یہ فطرت کے خلاف ہے۔ جب تک ہم ایک سوسائٹی میں نہیں آ جاتے اخوت، رواداری، اور شرافت انسانی کے جوہر آبدار کی حامل نہیں کر سکتے۔ مسلمان کا مفاد مسلمان کی ترقی مسلمان کی حکومت دریاست، مسلمان کی وزارت، مسلمان کی تنظیم اور ایسے ہی دوسرے الفاظ ان موانع پر بول سکتے ہیں جب کہ یہ چیزیں اصول اسلامی کے تحت ہوں۔ ورنہ لفظ مسلمان کا استعمال درست نہیں۔ ایسے شخص کو اسلام کا نام استعمال کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے جو اسلامی سوسائٹی کا فرد نہیں ہے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

غیروں سے دوستی

شعر نے ایسے لوگوں کے لئے جو اپنی خوئے غلامی کو تقدس کا پیراہن دے کر اپنے خبث باطن مذہب کی آڑ میں چھپاتے ہیں اور یوں خدا اور اُس کے رسولؐ اور اپنی جماعت کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں کتنے کھلے لفظوں میں فرما دیا ہے کہ:۔

وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ (۲/۹)

"وہ خود اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ کیا کر رہے ہیں!"

غیروں سے دوستی یا غلامی کی ابتدا میں وہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم ملت کو دھوکا دے رہے ہیں کامیاب ہیں لیکن نہیں سمجھتے کہ اس کی انتہا میں وہ خود دھوکے میں ہیں۔ علامہ نے بھی اسی دوستی اور غلامی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان لوگوں کو ان کی پوزیشن سے آگاہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن!

یہ سب وہ طبقہ جو ملت کے لئے ہمیشہ رہزنِ ایمان و حریت ثابت ہوتا ہے ان سے بچ رہنے مدارِ دین و تقویٰ کے تحفظ کا موجب۔ ان میں سے کچھ تو محض جہالت کی بنا پر اس مسلک کو اختیار کر لیتے ہیں لیکن کثیر تعداد ہوسِ پرستی کا شکار ہو کر دنیا کی منفعت کی خاطر ایسا کرتے ہیں۔ یہی طبقہ تھا کہ جب اس نے ملک میں تفریق و تشتت کا ایک دوسرا مذہب و ملت کو اپنے جذبات کا ذریعہ بنا کر ایسے فریب خوردوں

میں لپیٹ کر آگے بڑھا اور کہیں حاکمِ وقت کی اطاعت کو فریضۂ خداوندی قرار دیا، کہیں اسے سایۂ الٰہی ٹھہرا کر اس کی فرماں پذیری کو (نعوذ باللہ) خدا اور رسولؐ کی اتباع کا قائم مقام بتایا۔ کہیں اس کی خاطر جہاد بالسیف کو حرام قرار دیا۔ اور کہیں فسادِ ارض کی نصِ صریحہ سے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کا خیال تک لانا کفر کے مرادف بتایا۔ غرضیکہ یہ تھا وہ گروہِ حاملانِ دینِ متین اور مفتیانِ شرعِ متین جس نے اپنی نفس پرستی کی خاطر غیر خدا کی غلامی کی بدترین لعنت کو نعمتِ الٰہی بنا کر دکھایا اور یوں مذہب کی آڑ میں خواہشات کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا۔ علامہؒ نے ان ہی مفتیانِ شرع کے متعلق فرمایا ہے کہ:۔

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پُرکار و سخن ساز ہے۔ نمناک نہیں ہے
کیا صوفی و مُلّا کو خبر میرے جنوں کی
ان کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

ان ملاؤں کے برعکس جنھوں نے متاعِ دیں کو انگریز کے قدموں میں جھکا دیا تھا اپنے متعلق کہا کہ۔

بجلی ہوں نظر کوہ و بیاباں پہ ہے میری
میرے لیے شایاں خس و خاشاک نہیں ہے

اور ان مفتیانِ شرعِ متین کو ان کا مقام دکھاتے ہوئے فرمایا کہ ہے۔

عام ہے نقد مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

انگریز کے دور سے زوال کی سمت رخ کیا ان کے ہاں دیوار ٹوٹنے لگی
اور ہندو کے فرد کو وقت پیدا ہوا حکومت آہستہ آہستہ برہمنوں کے ہاتھ
میں منتقل ہونے لگی۔ اس تبدیلی کے ساتھ ہی ظاہر نظر آنے لگا
جب سے انگریز نے مسجدوں کی سمت میں تبدیلی پیدا کر دی گئی۔ اس
وقت نے اپنی منزلوں تک لنڈن سے آنے والوں اور گاندھی آشرم کی طرف
پیش کیا۔ جب اقتدار کی خوشنودی مزاج کے لئے ہندو اسلام امتیاز منانے
کا مقصد قومیت کا نظریہ تھا۔ اگر کثرت نہایت اطمینان و سکون سے
پورے ملک پر حکومت کرتے۔ تمام مذاہب میں عالمگیر سچائی کے وجود کو تسلیم
کرنے لگے۔ تاکہ خداوند حکومت یہ کہہ کر انہیں باب عالی سے دستکار
نہ دیں کہ تمہارے مذہب کو اپنے دین سے کمتر درجہ دے رہے ہو۔ کہیں
اس کو تعصب پر فضیلت دے اور ایجاد کے ذریعہ ملت کی تقسیم کو دے
دے۔ اس کیا یہ حقیقت قومیت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ
ہے کہ قرآن پاک کے مسلمانوں کو غیر کی دوستی سے روکنے کی شدت سے تلقین کرتا
ہے۔ اس پر انہوں نے یہ شروع کیا کہ قرآن کریم تو صرف ان کفار کی دوستی
سے روکتا ہے جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف جنگ و قتال کیا ہو۔ تمام کفار
کی دوستی سے منع نہیں کرتا۔ لہٰذا انگریز سے دوستی حرام اور ہندو سے ملاپ
جائز ہو تو قدرت کا احسان ہے کہ اس نے قرآن پاک کے ایسا بک نقد

پر پہرے بٹھا رکھے ہیں ورنہ یہ لوگ انہیں اپنی جگہ سے ہلا دیں) ایسے مسلمان اپنی سوسائٹی کو دھوکہ دے کر مسلمان نہیں رہتے۔ علامہ نے اس امتیاز کو واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ:-

کافر ہے مسلمان تو نہ شاہی نہ فقیری
مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی
کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیرِ مسلماں
مومن ہے تو ہے آپ ہی تقدیرِ الٰہی

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم تمام نوعِ انسانی کے ساتھ عدل و انصاف کی تاکید کرتا ہے کہ وہ مساواتِ انسانی کا سب سے بڑا علم بردار ہے۔ لیکن وہ انسانوں کے مختلف طبقات کے فرق کو بھی نظر انداز نہیں کرتا وہ صاف صاف کہتا ہے کہ ظالم اور مظلوم میں نمایاں فرق ہے۔ اگر تمہیں مظلوم کے ساتھ ہمدردی ہے تو اس کی مدافعت امداد کی خاطر ظالم کی مخالفت کرنی ہوگی۔ تم بیک وقت ظالم اور مظلوم دونوں سے دوستی نہیں رکھ سکتے۔ مظلوم سے دوستی کا لازمی نتیجہ ظالم سے ترکِ دوستی ہے۔ اس لئے کہ ظالم کا دوست بھی ظالم ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے۔

"اور اس طرح ہم ظالمین کو اُن کے عمل کی ہمرنگی کی وجہ سے ایک دوسرے کا دوست بنا دیتے ہیں۔" (۶/۱۳۰)

دوسرے مقام پر فرمایا کہ :-

"اور یقیناً ظالمین ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور اللہ تو متقین کا دوست ہے۔" (۴۵/۱۹)

اسی اصول وحدت فی الخیال اور عمل کے مطابق قرآن نے تمام اقوام انسانی کو دو جماعتوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ جو دنیا میں احکام الٰہی کے ساتھ چلتی ہے۔ دوسری جو غیر الٰہی قوتوں کے مالک ہوتے ہیں اور ان کی عبادت کرتے ہیں۔ دوستی کے لئے فکر و نظر میں یگانگت قلب و دماغ میں ہمرنگی اور خیال و عمل میں وحدت ضروری ہے۔ جہاں ان باتوں میں تضاد پیدا ہوا دوستی ختم اور دشمنی شروع ہوئی۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ حکومت کا باغی حکومت کے جاں نثار سپاہی کا دوست ہو۔ نور اور ظلمت۔ خدا اور شیطان بھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ مومن اور غیر مومن دوستی کے تعلقات پیدا نہیں کر سکتے۔ غیر مسلم خواہ انگریز ہو یا ہندو قرآن کے نزدیک دونوں ایک پلیٹ فارم پر ہیں۔ قرآن نے مومن کو دوست مومن کہا ہے۔

"مردان مومن و مومنات عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے دوست"

(۹/۷۱)

علامہ اقبال نے بھی غیر مسلموں سے دوستی کو سخت برا جانا ہے اور تاکید کی ہے۔ [illegible] ان سے [illegible] محبت نہ کیجئے۔ دینی مسائل میں نفرت [illegible]

سوالِ مے نہ کروں ساقیِ فرنگ سے میں
کہ یہ طریقۂ رندانِ پاک باز نہیں

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو کفار کی دوستی سے منع کرتے ہوئے ہدایت فرمائی ہے کہ۔

"جو لوگ ایمان والے ہیں انھیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ مومنوں کو چھوڑ کر کفار سے دوستی کے تعلقات پیدا کریں جس کسی نے ایسا کیا اس کا اللہ کے ساتھ کوئی سروکار نہیں رہا۔ بلکہ تمہیں چاہیئے کہ ان سے اپنے بچاؤ کا پورا پورا انتظام کرو۔ اور اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے (کسی اور سے مت ڈرو) اور انجام کار اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے"۔ ۵ (۳/۲۷)

اللہ نے اور بعض مقامات پر کفار کو مومنین کا کھلا ہوا دشمن کہا ہے اور متعدد مقامات پر یہی لفظ شیطان کے لئے استعمال کیا ہے۔ کیونکہ یہ دونوں قوتیں خدا کی سرکشی کرنے والے ہیں۔ اس لئے جس طرح کفار ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں شیطان بھی اُن کا ایسا ہی دوست ہوتا ہے۔ اور یہ تمام قوتیں دل کی خرابی کا باعث ہوتی ہیں۔ علامہ نے فرمایا۔

بُرا نہ مان ذرا آزما کے دیکھ اسے
فساد دل کی خرابی خرد کی معموری

ایک گروہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب وہ مسلمانوں کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہیں سے ہیں یعنی مسلمان ہیں مسلمان ان کے الفاظ پر اعتبار کر لیتے ہیں مگر خدا نے ان لوگوں کو منافق کہا ہے۔

جب یہ لوگ مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں مگر جب وہ اپنے شیاطین کے ساتھ خلوت میں بیٹھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم دل سے تو تمہارے ہی ساتھ ہیں۔ اُن سے (مسلمانوں سے) تو ہم تمسخر کرتے ہیں۔" ۵ ز (۲/۱۴)

قرآن کے کشاف کے پیش نظر ذرا دیکھئے کہ اپنے ہی اندر کون کون سے ایسے لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں اور اپنی ملت سے اس قسم کا تمسخر کرتے ہیں۔ ایسے شخص ضرور ہیں گے جو کفار کے ساتھ خلوت میں بیٹھ کر اُن کی دوستی کا دم بھرتے ہیں اور ظاہرا ہم سے ملتے ہیں اور ہم رکھتے ہیں۔ دیکھئے یہ ہے کہ یہ لوگ اس انداز کو اپنانے کے لئے کیوں مجبور ہو جاتے ہیں؟ ضروریات انہیں مجبور کر دیتی ہیں نفس یہ کہ انہیں ہر ذلت سے بچاتی ہے اور انہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ جینا ان کی ذلت کا باعث ہے۔

"جو فقر میں شان سکندری کیا ہے

فقر کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے"

[illegible] مسلمانوں کی [illegible] لیکن قرآن اس [illegible] نظر انداز [illegible]

"کسی قوم سے دشمنی تمھیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ
تم ان سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو کہ وہ تقویٰ سے
بہت قریب ہے۔"

اس سے واضح ہو گیا کہ عدل و انصاف کا حکم تمام انسانوں سے ہے خواہ وہ تمھارے بدترین دشمن ہی کیوں نہوں اور احسان و مروّت کی اجازت ان غیر مسلموں سے ہے جو عملاً جنگ میں مصروف نہ ہوں۔ اور دوستی کسی غیر مسلم سے جائز نہیں خواہ وہ شمشیر بکف ہو یا نہ ہو۔

انھیں یہ معلوم نہیں کہ جنگ اور قتل کے اور بھی طریقے ہیں۔ جو فریب کاریوں اور سازشوں کی آغوش میں پرورش پاتے ہیں۔ تو کیا ان سازش کرنے والوں کو سینے سے لگا کر رکھنا چاہیے؟ کیونکہ انھوں نے خون تو بہایا نہیں لہٰذا یہ نفرت کے قابل نہیں۔ افسوس کہ یہ لوگ اللہ اور اُس کے رسولؐ کے پیغام کو کبھی صاف اور سادہ الفاظ میں بیان نہیں کر سکتے کہ یہ کفار کا لحاظ کرتے ہیں۔

اے لَا اِلٰہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں
گفتارِ دلبرانہ کردارِ قاہرانہ

حالانکہ قرآن کریم نے مسلم کو تعلیم ہی یہی دی کہ وہ اُٹھ کر بے خوف و خطر کہہ دے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ اور طاغوتی قوتوں میں کود جائے اور اللہ اکبر کی صداقت کے سامنے اُن کے سر جھکا دے۔ آتشِ نمرود میں پروانہ وار چھلانگ لگا دے اور ثابت کرے کہ یہ آگ خود کسی دوسری قوت کے قبضے میں ہے جس کا نام ربِ کائنات ہے اور وہ اپنے ماں باپ بہن بھائی اور عزیز و اقارب سے صاف صاف کہہ دے

کہ اللہ یک بے سب قوتیں اُس کے ماتحت ہیں اور اگر وہ اس پیغام کو تسلیم نہ کریں تو اُن سے علیحدگی اختیار کرلے پھر اُنہی کے خلاف بغاوت کردے حتیٰ کہ وہ درست پر ایمان لے آئیں۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ طاغوتی قوتوں کے ہاتھ میں رزق دیکھ کر جھک جائے اور اُس کی غلامی اختیار کرلے۔ اس جینے سے تو مرجانا بہتر ہے ؎

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

مومن کا مقام رزق کی دیویوں میں نہیں ہے رزق کے خزانوں کی چابیاں تو صرف اللہ کے ہاتھ میں ہیں وہ چاہے تو پکے ہوئے خوشوں کے دانے جلا دے رزق تو وہی ہے۔ اس لئے ان چیزوں سے بے نیاز ہو کر خدا کا سپاہی بن جانا ہی آئینِ مسلم ہے۔

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

سپاہی اور اس کا مسلک

اسلام کے نزدیک ہر مسلم بذاتِ خود ایک سپاہی ہے۔ کیونکہ مسلم اور سپاہی کی ایک کی تعریف ہے۔ یعنی جو اللہ اور اس کے دین کی حفاظت کے لئے ہر وقت تیار رہے۔ اللہ کے یہ سپاہی دو جماعتوں یا گروہوں میں تقسیم ہوتے ہیں ایک وہ جو شمشیر کا بند بدن میں نکل جاتے ہیں دوسرے وہ جو میدانِ جنگ میں بے شمشیر طاغوتی قوتوں کو اپنے علم و ہنر سے شکست دیتے ہیں۔ اس گروہ

ہیں صاحبِ شمشیر کے علاوہ سب قسم کے مسلم جانتے ہیں جن کا نصب العین حفاظت دینِ الٰہی ہوتا ہے۔ انہی مسلموں کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ:۔

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اس سپاہیانہ زندگی کی آزمائشوں کے بعد مسلم کو بہت بلند مقام عطا ہوتا ہے جس کی طرف دنیا کی بڑی سے بڑی عزت للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہے۔ جیسا کہ قرآنِ کریم میں ہے۔

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (۲/۱۲۴)

"خدا نے فرمایا (اے ابراہیم) میں تجھے ان لوگوں کے لئے امام بنانے والا ہوں"۔

نوعِ انسانی کی امامت شرفِ انسانیت کی انتہا ہے اور تسلیم و رضا کی مرکزی ہیں تیت حنیفہ کے لئے ہر دور میں امامت و قیادتِ انسانی کے راز سربستہ ہیں۔ حضرت موسیٰؑ جب دربارِ فرعون میں دوبارہ تشریف لائے تو سینہ میں سوائے ایک اللہ کے کسی کا خوف مضمر نہیں تھا۔ دربار میں پہنچ کر سپاہیانہ شان سے فرعون کو مخاطب کر کے کہا میں خدا کا فرستادہ ہوں اس لئے حق کے سوا کچھ اور نہ کہوں گا مطالبہ میرا فقط ایک ہے۔ وہ یہ کہ بنی اسرائیل کو غلامی پہ مجبور نہ کر۔ خدا کے فرستادہ کے حوالے کر دے تاکہ وہ انہیں انسانوں کی انسانیت سوز محکومی سے چھڑا کر خدا کی عبادت میں لائے۔ اور اس طرح انہیں انسانیت کی زندگی سے وشناس کرائے۔ یہ تھا وہ خدا کا سپاہی جس نے فرعون جیسے صاحبِ سامان کے سامنے حقِ الٰہی کا اعلان کیا اور غلام انسانوں کو واپس مانگا۔ یہ ہے وہ جرأت ایمانی جو مسلم سپاہی کو زندہ و تابندہ رکھتی ہے۔

سویا بھی ہے مردِ مسلماں کبھی تو نے
کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگر دار
تجھ میں یہ تموّر بھی آجائے تو مومن
یا خالدِ جانباز ہے یا حیدرِ کرّار

فرعون سے جنگ کی یہ پہلی داغ بیل تھی جو اس طرح ڈالی گئی۔ جنگ کی تاریخ میں کہیں اس کی مفاد جھلکتے نظر نہیں آتے۔ کہیں خود غرضیاں تبسم ریز نہیں ہیں۔ نہ یہ رنگ و نسل کی جنگ ہے اور نہ ہی قوم و وطن کی بلکہ جنگ ہے انسانیت کی ظلم کے خلاف۔ جو بین دین ہے۔ لادینی نہیں ہے۔

دیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر
دیں ہو تو ہے تریاق جو ہر زہر کا تریاق

مسلم سیاسی سازی کی مذمت و قوت بازو کی تعلیم دیتا ہے لیکن اسی دنیا میں اس کی مخالف گروہ بھی موجود ہے جسے دوسرے لفظوں میں علماء کی جماعت کہتے ہیں۔ اسی گروہ نے حضرت عیسٰیؑ کی سخت مخالفت کی اور اسی جوشِ مخالفت میں ان حربوں پر اتر آئے جو فی الحقیقت باعثِ ننگِ انسانیت ہے۔ انجیل میں اس گروہ کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے باہم مشورہ کیا کہ

اگر یہ بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے۔ البتہ یہ ہمارے لئے مصیبت ہو گی۔ اس لئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقہ کے موافق عمل کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا جب ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے تو مجبور ہوں گے کہ اپنی

روٹی عطیہ کے طور پر مانگیں۔" (فصل ص۱۴۲)

کسی قوم کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے اس کی غلامی کی زنجیریں پختہ تر کرنے کے لئے ان کے پُرفریب خانقاہ نشینوں اور مسانید علم و ارشاد پر برخود غلط تمکن گزینوں کا کس قدر ہاتھ ہوتا ہے؟

خدا کا سپاہی ان کے غلط اصولات زندگی کو نیست و نابود کرنے کے لئے شمشیر بکف نکلتا ہے اُس کا نصب العین ان اصولوں کی جگہ قوانین الٰہی کا نفوذ ہوتا ہے۔ جب وہ حق کی راہ پر تلوار سے کام لیتا ہے تو یہ چلا اُٹھتے ہیں کہ دیکھو یہ کس قدر جابر و ظالم ہے۔ کس قدر سخت گیر ہے۔ کتنا بے رحم اور بے انصاف ہے۔ اور اس کے بعد اس کے دین پر بھی یہی الزام لگایا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ دراصل عشق و مستی کا ظہور ہوتا ہے ؎

یہ جبر و قہر نہیں ہے یہ عشق و مستی ہے
کہ جبر و قہر سے ممکن نہیں جہانبانی

اس میں کسے کلام ہے کہ جہاں تک باطنی قوتوں کا تعلق ہے حضرت انبیاء کرام شرفِ انسانیت کی معراج پر ہوتے ہیں۔ لیکن وہ انقلاب جو ان کے ہاتھوں سے معرضِ وجود میں آنے والا ہوتا ہے اس کے لئے مادی قوتوں کی بھی ازبس ضرورت ہوتی ہے۔ گو کیریکٹر کی قوت بڑی قوت ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مادی قوتیں نہایت لازمی ہیں۔ اگر یہ انقلاب محض باطنی قوتوں کی بنا پر پیدا ہو سکتا تو حضرت انبیاء کرام اور ان کی مقدس جماعتوں کو صاحبِ دست و بازو ہونے کی ضرورت نہ پڑتی۔ اگر یہ باطنی قوت ہی نجات کا موجب ہوتی تو آج

سوائے رہبانیت کے کچھ نظر نہ آتا لیکن یہ نظریہ فیل ہو چکا ہے۔ زمانے نے اسے نقش غلط کی طرح مٹا کر رکھ دیا ہے اور قرآن کی حقیقت کو اپنی زبان سے بار بار دہرایا ہے کہ زمین پر قانون بغیر قوت کے نافذ نہیں ہو سکتا۔ لیکن مادی قوتیں تنہا درست نہیں ہیں کیونکہ نری مادی قوتیں تو چنگیزیت اختیار کر جاتی ہیں اس لئے قرآن کی تعلیم کی رو سے تقویٰ اور مادی قوتوں کی معاونت سے ہی نظام کائنات درست رہ سکتا ہے۔ ہمارا یہ انداز کہ سپاہی کے لئے ضروری نہیں کہ وہ صاحب قرآن بھی ہو سراسر غلط ہے۔ ہم نے دین کا نظام مولوی کو سونپ دیا درست تھیکہ پر حاصل کر لیا ہے یہ نظام قطعی غلط ہے۔ خود ہر سپاہی کو امامت کے فرائض انجام دینے چاہئیں کیونکہ جب وہ صاحب تقویٰ ہو کر صاحب شمشیر ہوگا تو نظام ملی کی صحیح طور پر حفاظت کر سکے گا کیونکہ یہ امام قوت والا ہے۔

وحدت کی حفاظت نہیں بے قوتِ بازو
کی نہیں کچھ کام یہاں عقلِ خداداد

تو ایسا سپاہی بیک وقت دنیا کی ضرورت بھی انجام دیتا رہے گا اور دین کی بھی۔ اور پھر لطف یہ کہ ٹھیکہ کے مولوی کی طرح یہ اجرت بے نیاز ہوگا۔ یہ سپاہی اپنی اذانوں کا معاوضہ طلب نہیں کرے گا۔ اپنی امامت کی قیمت نہیں لے گا۔ یہ اتباع کرے گا اپنے رسولؐ کا جس کے متعلق خدا نے فرمایا کہ۔

"اے پیغمبر اسلام تم کہہ دو کہ میں اپنی اس خدمت پر اس کے سوا اور کوئی اجر نہیں مانگتا کہ تم میں سے جو چاہے وہ اپنے پروردگار تک پہنچنے کے لئے راستہ بنا لے۔" (۲۵/۵۷)

پھر جب یہ اجرے بے نیاز امام اللہ اکبر کی صدا سے دنیا کو توحید کی دعوت دے گا تو یہ آواز دل سے نکل کر دل میں جگہ پیدا کرے گی کیونکہ اس کا مقام اور کہیں نہیں ہوتا ؎

اس کے نفسِ گرم کی تاثیر ہے ایسی
ہو جاتی ہے خاکِ چمنستاں شرر آمیز
اس مردِ خود آگاہ و خدا مست کی صحبت
دیتی ہے گداؤں کو شکوہِ جم و پرویز

مسلم کا مقام اس قدر بلند ہے کہ ہمارا نوجوان طبقہ اسے سمجھ ہی نہیں سکا۔ اور نہ ہی اسے ہمارا یہ مدعی سمجھتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کو زمین پر لٹا دیا اور چھری ہاتھ میں لے کر اللہ کی رضا کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ زمین کانپ اٹھی آسمان ششدر تھا کہ یہ کیا تماشا ہے۔ فرشتے انگشت بدنداں تھے کہ یہ کیسی حرکت ہے کہ انسان انسان کا خون بہا رہا ہے۔ لیکن ہمراز کہہ رہا تھا کہ ؎

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اگرچہ حضرت ابراہیمؑ کو اللہ نے اس قربانی کے لئے حکم نہیں فرمایا تھا وہ محض خواب کو مجاز پر محمول فرما کر بیٹے کی قربانی کے لئے آمادہ ہو گئے مشیت ایزدی نے بھی شفقت کی طرح آخری منزل تک انہیں اسی دھن میں چلنے دیا کہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ نوعِ انسانی کے لئے بطور امام منتخب کیا جا رہا تھا وہ اس منصبِ حیات کا پیکر تھا۔ اور یہ سب باتیں محض زبان سے ادا نہیں کرتا بلکہ

اس کی مثال بھی وہی ہے جو اس کا ذکر ہے ؎

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

دنیا نے حضرت ابراہیمؑ کو قہر و جبار کہا اور کافروں نے پراپیگنڈا کیا کہ جس شخص کا مسلک اپنی اولاد پر سختی کروا سکتا ہے وہ دوسروں کو کب چھوڑیگا لہٰذا اس کا فعل اور یہ دونوں (نعوذ باللہ) ظالم ہیں۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ یہ سپاہی پیغمبر یتیم کی بن جاتا ہے۔ یہ فولاد ہوتا ہے کفر کے مقابلہ میں۔ قہار و جبار ہوتا ہے ظالموں کے لئے اور مظلوموں کے لئے رحمت ؎

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں

لیکن آج مسلمان نے وہ سپاہیانہ لباس بدن سے اتار پھینکا ہے۔ جس نے اس سے وہ شرافت و انسانیت ختم کر دی ہے۔ ذہنی تصورات اور قلبی کیفیات بدل جاتے ہیں ہر دور میں نئی نئی بدل جاتی ہے۔ اس لئے جب ذہن کا مذاب کو جاتا ہے تو وہ کبھی دوسرے منزل نہیں ہوتا۔ انہی واقعی کیفیات و تصورات کے بدل جانے سے عمل حیات اور اہلیت ختم ہو جاتی ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک قوم اپنے اندر زندہ رہنے کی صلاحیت عمل پیدا کرے ؎

یہ نہیں ہو سکتا کہ اختیار پہ دکار آ بادیوں کو ناحق ہلاک

کرے حق کے بندے صالح جو ہوں ۱۲

اس ہلاکت کے خطرہ کے احساس سے علامہ نے مسلم سپاہی کو متنبہ کیا ہے ؎

تیرا امام بے حضور تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گزر، ایسے امام سے گزر

یہ ہلاکت اُس وقت ہوتی ہے جب کوئی قوم سلامتی کی راہ قانون فطرت کو چھوڑ کر غیر فطری راہیں اختیار کر لیتی ہے۔

"اور ہرگز ایسا نہیں ہوتا کہ اللہ ان پر ظلم کرتا ہے مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔" (۹/۷۰ - ۲۹/۴۵)

ہلاکت اور تباہی ہمیشہ اپنے کاموں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اگر قوم نوح غرق ہوئی تھی تو اپنی ہی خطاؤں کے باعث۔ اگر قوم ثمود تباہ ہوئی تھی تو اپنے ہی جرائم کی وجہ سے۔ اور اس کے برعکس جب قوم کے افراد نیکی کی طرف رجوع کرتے ہیں، اور اللہ کی راہوں پر گامزن ہوتے ہیں اور اللہ کے قوانین کو زمین پر نافذ کرنے کے لئے سر بلند کرتے ہیں تو ان کے نعرۂ حق و صداقت سے پہاڑ دہل جاتے ہیں۔ وہ آگ جس کا خاصہ جلا دینا ہے جب اس کی لپیٹ میں کوئی ابراہیم کود پڑتا ہے تو یہ اپنی فطرت بدلنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ پانی جس کا خاصہ بہا لے جانے کا ہے جب کوئی کاروانِ موسیٰ اس کے اندر قدم رکھتا ہے، تو اپنی طغیانیاں سکیڑ لیتا ہے ؎

پڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغ
ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ

پینتیس برس کی سعی و کاوش اور جدّ و جہد کے بعد ۱۰ھ میں حضورؐ نے حج کا ارادہ فرمایا۔ اس خبر کا عام ہونا تھا کہ سارا عرب ہمرکابی کے لئے اُمڈ آیا۔ ذیقعدہ کی ۲۶ تاریخ حضور مدینہ منورہ سے جانب کعبہ روانہ ہوئے۔ مدینہ سے باہر چھ میل کے فاصلہ پر قیام فرمایا۔ دوسری صبح حضور نے احرام باندھا۔ اور بلند آواز سے فرمایا کہ۔

"تیرا کوئی شریک نہیں اے خدائے بزرگ و برتر۔ تیرے بندے تیرے حضور میں حاضر ہیں۔ حمد و ستائش کی مرکز تیری ہی ذات ہے۔ اس میں کوئی اور شریک نہیں۔ حکومت صرف تیرے لئے ہے۔ اس میں کسی اور کا حصہ نہیں ہے۔"

اس آواز سے دشت و جبل گونج اُٹھے۔ یہ کاروانِ عشق و ذوق تمام دامنِ صحرا پر زمین کے تپتے ہوئے ذروں کی طرح، بحدِ نظر پھیلا ہوا تھا۔

تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل

خدا کے سپاہیوں کا یہ قافلہ تقدس کی زمزمہ پردازیوں سے منزل بمنزل آگے بڑھتا گیا۔ ان سپاہیوں کے سینوں میں تڑپتے ہوئے دل۔ ان اماموں کی آنکھوں میں تیرتی ہوئی نرگسیت۔ ان رہنماؤں کی پیشانیوں میں چمکتے ہوئے سجدے۔ ذوقِ بندگی کی مثال کہ بہادر نوشؓ جن عمل کی کامرانیوں اور سعی پیہم کی شادکامیوں کی جنت پشت دامن میں لئے ہوئے بڑھتے چلے گئے۔

نہ ہو جری سے یہ ہے شوق تیری سے نہ ہو ہے تمہ شدہ ہے یہ رگ و پے میں ہے

یہ عصارۂ روزگار جماعت یہ لشکر خامست۔ یہ عسکر خود آگاہ۔ یہ حریت و مساوات کے علم بردار۔ یہ احترام انسانیت کے پیغامبر

مٹ نہیں سکتا کبھی مرد مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرّ کلیم و خلیل

حضور کے ساتھی سپاہیوں نے جوم جوم کر اللہ کا شکر ادا کیا اور وجد میں آکر کسی سپاہی کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

ساقیِ رباب زوقِ فارس میدانِ شوق
بادہ ہے، اس کا رفیق تیغ ہے اس کی چنگ

جب کعبہ پر نگاہ پڑی تو حضور نے مسرت کے والہانہ انداز میں فرمایا کہ خدا کے سوا کوئی حاکم و آقا نہیں۔ فرشتوں نے جب ان سپاہیوں کو بحالت مسرت میں دیکھا تو کہا۔

مرد سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لا الٰہ
سایۂ شمشیر میں اس کی پناہ لا الٰہ

اللہ کے یہ سپاہی صرف اللہ کے سامنے جھکتے ہیں۔ دنیا کی کوئی دوسری طاقت انہیں نہیں جھکا سکتی۔ اقبالؒ نے اس سپاہی کے متعلق فرمایا ہے۔

اس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم
اس کا سرور اس کا شوق اس کا نیاز اس کا ناز
طاقت شبگیر کا ہے نشہ اس کا جام
غالب و فرماں روا کار کشا کارساز

خاکی و نوری نہاد بندہ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز
غنی کے آئینے میں سپاہی کو اس کی جھلک دکھاتے ہوئے فرماتے ہیں
جن کی نگاہوں نے کی تربیتِ شرق و غرب
ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں
جن کے لہو کی طفیل آج بھی ہیں اندلسی
خوش دل و گرم اختلاط سادہ و رنگیں جبیں
بوسنیہ میں آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگِ حجاز آج بھی اس کی فضاؤں میں ہے

نہ پھر دورِ حاضرہ کے سپاہی کے دل کی حرکتوں پر ہاتھ رکھ کر کلیم ملت فرماتے ہیں۔

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں
آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے ستارہ
غنی و دیگر یہ ہے کہ نسلی نہیں ہے
عشق بلا خیز کا قافلہ سخت جان

علامہ کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ عدم کی نگاہ ہمارے اس دور پر بھی تھی۔ حصول پاکستان کے بعد ہماری بدلتی ہوئی زندگیوں کے رخ سے غافل نہیں تھے۔ آپ کا یہ شعر صداقت بیان کے لئے کافی ہے۔

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا؟
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا؟

اذان اور امام

اسلام کی سب سے پہلی اساس بانی، سلام سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ میں تھی جس طرح دنیا کا آخری اور عالمگیر دین دینِ اسلام ہے اسی طرح دنیا کے سب سے بڑے امام سید الانبیا۔ خیر البشر رسول اللہ ہیں۔ آپ بیک وقت بہترین سپاہی بھی ہیں اور عمدہ امامِ اعظم بھی۔ ایک ہی میدان میں فوجی لباس سے آراستہ ہو کر جہاں آپ نے سپاہیانہ فرائض انجام دئے۔ وہ دنیا نے محسوس کیا کہ ہمارا امام اللہ کا وہ سپاہی ہے جو اللہ کا رسول ہے۔ اور عشق کی چنگاری حضرت بلال رضؓ کے خرمنِ عشق میں موجود تھی کہ سینے میں وہ سوز تھا کہ اللہ اکبر کی صدا سے فضا کانپ اٹھتی تھی۔ ان اماموں کی کمر میں تلوار لٹکی رہتی تھی۔ ان اماموں نے کسی مسجد کو مقامِ حیات نہیں بنایا اور مسجد کی آمدنی کو ذریعہ معاش نہیں ٹھہرایا بلکہ ایسے نااہل کمزور اور بزدل شخص سلام کا سپاہی بن ہی نہیں سکتا اور جو اسلام کا سپاہی نہیں وہ مسلمان نہیں ہے۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

اس دور میں مسجدوں کے مولوی صاحبان سرف مسجد کی روٹیوں پر جیتے ہیں نہ ان میں قوتِ بازو کی جھلک ہے نہ محنتِ شاقہ کا ذوق ہے۔ یہ اس قدر تن آسان ہیں کہ ان کے لئے روٹی بھی یہیں پہنچا دی جاتی ہے۔ یہ روٹی دینے والے خیرات صدقہ یا بھیک دیتے ہیں۔ کیا مسلمان پر یہ تن آسانی حرام نہیں ہے؟ کیا وہ امام جو قوم کو صرف اللہ کے خوف سے نہ ڈرائے اور جہاد کے لئے ہر وقت تیار نہ رکھے اور خود بھی نہ رہے امامت کے قابل ہے!

کیا وہ اس کے لائق ہے کہ مُردوں کی طرح اس کی نماز ادا کی جائے؟ کیا یہ فرد قوم کے جسم پر ناسور نہیں ہے؟ کیا ہمیں جائز ہے کہ ایسے تن آسان آدمی کے پیچھے نماز ادا کریں اور اللہ کی عبادت انجام دیں؟ یہ مولوی جو اس حقیقت سے واقعی ناواقف ہے کہ

واقف ہو اگر لذتِ بیداری شب سے
اُڑتی ہے ثریا سے بھی یہ خاک پُر اسرار

کیا اس مولوی کو وہ زمانہ یاد نہیں ہے کہ جب حضور خود حضرت بلال رضؓ سے اذان کی فرمائش کیا کرتے تھے۔ وہ کونسی چیز تھی جو حضور کو بے چین کر دیتی تھی کہ وہ بلال رضؓ کی آواز سنیں۔

ناگہاں ہمت بانگِ بلال سے ہوئی لبریز
دو نعرہ کہ پھٹ جائے جس سے دلِ صحرا

ایسا ہی وقت بھی ایسا ہی ہوتا تھا کہ اذان بلند ہوتی ہو اور مسلمان اس کے فریب سے گذر گئے ہوں اس طرح پہلوتہی کا ثبوت دیا ہو جیسے کہ مستعدی

نہیں۔ یا اس انداز سے آنکھ چرا کر گذر گئے ہوں جیسے بلانے والے سے کوئی رابطہ
و ربط ہی نہیں ہے اور مسجد کی مختصر سی منزل کو یوں تیزی سے کاٹ دیا ہو جیسے تلووں
میں کانٹے چبھ رہے ہوں۔ اگر نہیں تو ماننا پڑے گا کہ وہ اذان نہیں تھی اللہ کے سچے
بندوں کے سچے دلوں سے نکلی ہوئی آواز نہیں بلکہ خدا کی آواز کا ترجمہ تھا جسے وہ
خود بھی سمجھتے تھے اور سنانے والوں نے خوب سمجھ کر کہا تھا۔ اور سننے والے
اس آواز پر ایمان رکھتے تھے کہ اسی وقت دنیا کو چھوڑ کر اپنے پروردگار کے
حضور میں پہنچ جائے اور اس کی نعمتوں کا شکرانہ ادا کر کے آئے۔ یہ اذان درحقیقت
خدا کا پیغام ہے۔

دنیا کی عشا ہو جس سے اشراق
مومن کی اذاں ندائے آفاق

آپ کہیں گے کہ اگر یہ اذان اللہ کا بلاوا ہے اور ہم سب اس کے بندے
ہیں تو پھر ہمارے قدم اس کی طرف کیوں نہیں اٹھتے؟ آپ کا خیال درست
ہے۔ بات یہ ہے کہ ہمارا موذن صاحب ایمان نہیں ہے۔ وہ بلاوا نہیں ہے
بلکہ نوکری پوری کرتا ہے ورنہ محلہ والے اس کی روٹی بند کر دیں۔ یہ روٹی کا
مسئلہ اس قدر نازک ہے کہ انسان اس کی طاقتوں کے سامنے جھکنے پر مجبور
ہو جاتا ہے۔ اسی لئے اللہ نے فرمایا دیا ہے کہ ——— اپنی دنیا آپ
پیدا کر اگر زندوں میں ہے۔

اگر یہی مولوی اپنی روٹی اپنے زور بازو اور محنت شاقہ سے کما کر حلال کی روزی
کھائے تو یقیناً اس کے اندر وہ تمام جوہر آجائیں جس کا دوسرا نام خودی ہے۔

جب یہ مختار نہ رہے گا یہ خدا کے معاملہ میں کسی کی رعایت نہیں کرے گا۔ یہی بیباکی مومن کا نشان ہے اور مسلم کی پہچان ہے لیکن ہمارا مسجد کا ملا جس کی ساری زندگی قرآن کی تاویلوں میں گزر جاتی ہے جو محض اپنے اس ذریعہ معاش کو برقرار رکھنے کے لئے خلق دین کی تبلیغ سے بھی گریز نہیں کرتا اپنی شرافت اور اپنے انسانیت سے بے خبر رہتا ہے۔ اور یہی بے خبری ذلت ہے۔ ورنہ انفرادی ذلت پوری کی پوری قوم کی ذلت بن جایا کرتی ہے۔ جس قوم کے امام ذلیل ہوں گے۔ وہ قوم کیونکر صاحب عزت ہو سکتی ہے اور کیسے اللہ کے انعامات کی مستحق ہو سکتی ہے۔ بالکل سی حالت میں ہمارے امام ہیں۔ جس کے متعلق اقبال نے فرمایا ہے کہ:

عجب نہیں کہ خدا تک تیری رسائی ہو
تیری نگاہ سے پوشیدہ آدمی کا مقام
تیری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال
تیری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

ہمارے مولوی انگریز کے زمانہ میں یہ بھی ہوا کہ ان علماء نے ان کی ملازمت اور روٹی قرآن جائز کیا اور پھر ہندو کی غلامی کے دن کو بھی مناسب فرمایا۔ اور قرآن کی آیات کریم کو اس انداز سے اپنایا کہ خود ہضم کر دیئے۔ اقبال نے ان کے متعلق کہا۔

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

دوسری جگہ ان اماموں کو مخاطب کیا ہے۔

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے؟
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

اپنے ماضی کے امام کی تصویر دیکھ کر فرمایا کہ

میں نے اے میر سپہ تیری سپہ دیکھی ہے
قل ھو اللہ کی شمشیر سے خالی ہیں نیام

اور ان مفتیانِ زمانہ کو تعلیم دی:۔

چمن میں تربیتِ غنچہ ہو نہیں سکتی
نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریکِ نسیم

جب علماء نے ہندو کے خلاف جہاد کو خلافِ اسلام قرار دیا تو علامہ نے کہا

فتوٰے ہے شیخ کا کہ یہ زمانہ قلم کا ہے
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر

اس مولوی طبقہ نے اپنے خداوندوں کو خوش کرنے کے لئے جہاد کو اس طرح غلط لباس پہنا کر پیش کیا کہ ہمارا نوجوان طبقہ اس تقریر سے باغی ہو گیا۔

تیغ و تفنگ دستِ مسلماں میں ہے کہاں
ہو بھی تو دل ہیں موت کی لذت سے بے خبر

مولوی صرف مسجد کی چار دیواری میں گھر کر رہ گیا اس نے تمام متاعِ حیات فرنگی کے ہاتھ فروخت کر دی:۔

شان آنکھوں میں نہ جچتا تھا جس کا داغِ سجود
خریدلی ہے فرنگی نے وہ مسلمانی

اس متاعِ دین و ملت کو بیچنے کے بعد مولوی حجرے میں بیٹھ گیا اور خلوت نشین ہو کر اللہ ھُو کرنے لگا۔

یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور
تیری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

مولوی کے اندر دل سے سوز و سازِ حیات ختم ہو گیا ایک ڈھانچہ رہ گیا۔ جس کی غذا انرج کے دا کچھ نہ رہ گئی۔

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

اور سمجھا یا کہ ان بتوں کے حضور سے سر اُٹھا کر اور صرف اللہ کے آستانے پر جھک جا کہ نجات کا مقام وہی ہے

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اقبال نے ایک ایک مسجد کے مولوی کو پرکھ کر دیکھ لیا اُسے کہیں اور کسی دل میں ایمان کی جھلک نظر نہ آئی

وہ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستی کردار

پیشِ دور کے نوجوانوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ یہ امام تیرا امام نہیں

ہے نہ یہ امامت کے اہل ہے۔

ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

کچھ ان فقیہانِ دورِ حاضرہ کی مذمت کرتے ہیں:۔

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ!
مقصود سمجھ میری نواہائے سحری کا!
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی خود نگری کا

لیکن ان اماموں پر اقبال کا کچھ اثر نہ ہوا اقبال نے بہ اندازِ شکایت کہا۔

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

کبھی اللہ کی غیرت کو ضرب لگانے کی سعی فرمائی ہے۔

ہے میری بانگِ اذاں میں نہ بلندی نہ شکوہ
کیا گوارا ہے تجھے ایسے مسلماں کا سجود؟

جب ان مولویوں کی یہ سرد مہری دیکھی کہ ان میں غیرت و قوت کا شائبہ تک نہیں تو فرمایا۔

فولاد کہاں رہتا ہے غیرت کے رانق
پیدا ہو اگر سکی طبیعت میں تری

خود دار نہ ہو فقر تو ہے تہمت الٰہی
ہو صاحبِ غیرت تو ہے تمہید امیری

اور پھر اس حقیقت کا اعلان کر دیا کہ

ہے سر میں پوشیدہ موت بھی ہے تیری
تیرے بدن میں اگر سوزِ لا الٰہ نہیں

بجائے اس کے کہ یہ طبقہ اسی مردِ قلندر کی دولت سے مالا مال ہو کر قوم و نفس کی تباہی سے بچ لیتا اُلٹا اقبال پر کفر کے فتوے دینے لگا۔ اس پر اقبال نے کہا۔

یہ صوفی و ملا کو خبر میرے جنوں کی
انکا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

اقبال نے کہا ہے کہ یہ فریضہ تمہارا تھا تم عالم تھے صاحبِ قرآن تھے میں مذہب زدہ تھا تمہیں لازم تھا کہ نوجوانوں میں تعلیم الٰہی عام کرتے مگر۔

نہ دیا نشانِ منزل تجھے اے کلیم تو نے
سبھی کچھ ہے یہ تجھ سے تو نہ رہ نشیں نہ راہی

اور آخر میں فرمایا۔

یہ سعی ہیں نازک جو تیری رضا ہو تو کر
کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریق خانقاہی

پاسبانِ ملت

تاریخ کے اوراق کو ساڑھے تین ہزار سال آگے الٹئے اور قوم بنی اسرائیل سے ہندی مسلمانوں تک آپہنچئے۔ آپ دیکھیں گے کہ انیسویں صدی کے اخیر اور بیسویں صدی کے اوائل میں یہاں کے مسلمانوں کی حالت بعینہٖ وہی ہو چکی تھی جس کا نقشہ قرآن کریم نے داستان بنی اسرائیل کی شکل میں کھینچا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بحرِ ملت کی ہر شاخ پر افسردگی اور پژمردگی چھا چکی تھی۔ مدت ہائے دراز کی غلامی اور محکومی سے ان کے حوصلے پست، ہمتیں کمزور، افکار جامد، اعمال خام، ارادے سقیم اور تمنائیں عقیم ہو چکی تھیں۔ ہر شعبۂ زندگی، بساطِ بے نظام، اور ہر فرد کارواں، ناقہ بے زمام تھا، دماغ فکر سے عاری۔ دل، سوز سے خالی۔ نگاہیں بے نور، قلوب بے حضور۔ قوم کیا یک راکھ کا ڈھیر تھی جسے مخالف ہوائیں جدھر جی چاہے اڑائے اڑائے پھر رہی تھیں یہ تھا وہ جس میں مبدءِ فیض کی کرم گستری نے اقبال جیسا مردِ خود آگاہ خدا مست اس قوم کو عطا کر دیا جس نے اپنی نفس گدازیوں سے اس مُردوں کی بستی میں صورِ اسرافیل پھونک کر ان میں حیاتِ نو کے آثار پیدا کر دیئے اور اپنی شعلہ نوائیوں سے راکھ کے اس ڈھیر میں پھر سے زندگی کی چنگاریاں نمودار کر دیں۔ اس نے اپنے گرد و پیش نظر دوڑائی تو اسے بالعموم وہی بڑے بوڑھے دکھائی دیئے جن میں تبدیلی احوال کی صلاحیتیں ختم ہو چکی تھیں۔ اس لئے اسے سوچنا پڑا کہ وہ اپنے اس پیغام کو جس کا ایک ایک لفظ حشر ساماں اور ایک ایک حرف برق ساماں تھا۔ کس کے سامنے پیش کرے۔ لیکن اسے اس فیصلہ میں کچھ دقت نہ ہوئی۔ اس لئے کہ تاریخ کے اوراق، فلسفہ کے فرامین، فطرتِ انسانی کے مشاہدات اور قرآن کریم کے حقائق

دورِ حاضر نے یہ حقیقت اس پر بے نقاب کر دی تھی کہ قوم کی تقدیر ہمیشہ ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھوں میں ہوا کرتی ہے۔ ان کے قلب و دماغ کی صلاحیتیں، ان کے خونِ گرم کی حرارتیں، ان کا زورِ بازو، ان کا جوشِ کردار ایک کفِ بداماں سیلاب کی طرح اٹھتا ہے اور ہر ٹکرانے والی قوت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ قوموں کی تخلیق نو، ان کے نوجوانوں کے کوہ شکن ارادوں کی رہینِ منت ہوتی ہے۔

اس لئے یہی وہ طبقہ تھا جسے انھوں نے اپنے تصورات کی آماجگاہ، اپنی امیدوں کا مرکز، اپنی تمناؤں کا محور اور قوم کے مستقبل کا مظہر قرار دیا اور اسی لئے اپنے پیغامات انقلاب آفریں کا درخورِ تخاطب سمجھا۔ انہی کے لئے وہ دعائیں مانگتے تھے کہ

جوانوں کو مری آہِ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اور انہی کو اپنے سوز و گداز، تپش و خلش، تڑپ اور اضطراب کا وارث بناتے تھے۔ بالِ جبریل کے ساقی نامہ میں دیکھئے۔ جذب و کیف کی کس والہانہ لے میں کہتے ہیں کہ رب العزت ملتجی ہوتے ہیں کہ

تیرے آسمانوں کے تاروں کی خیر — زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے — مرا عشق، میری نظر بخش دے
مسلمان دیدہ ترکی بے خواب دل — مرے دیں کی پوشیدہ بے تابیاں
نگہ میں مری آرزوئیں مری! — مسیحائی میری، جستجوئیں مری
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر — اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے ٹیلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے - ٹھکانے لگا دے اسے

ان کی آرزو ہی یہ تھی کہ جس پیغامِ انقلاب انگیز کو وہ قوم کے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ نونہالانِ ملت کے قلب کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو جائے تاکہ وہ وہاں سے زندہ آرزوؤں کا چشمہ بن کر ٹیلے اور خیابانِ ملت کو اس طرح سیراب کر دے کہ اس کی ایک ایک شاخ پھر سے شگفتہ و شاداب نظر آنے لگ جائے اسی لئے وہ دعائیں مانگتے تھے۔

تاریخی آثار و شواہد جو ان کے نورِ بصیرت سے ان کے سامنے بے نقاب ہوتے چلے جاتے تھے، اس حقیقتِ کبریٰ کو واضح کئے دیتے تھے کہ

گرچہ اس دیر کہن کا ہے یہ دستورِ قدیم
کہ نہیں میکدہ ساقی و مینا کو ثبات
قسمتِ بادہ مگر حق ہے اسی ملت کا
ہنگیں جس سے جوانوں کو ہے تلخابِ حیات

لیکن ان کے ہاں محض شاعرانہ جذبات نگاری نہ تھی بلکہ ان کی نگہِ حکمت و بصیرت زندگی کے حقائق کو پرکھتی اور ہر شے کو اس کے حقیقی مقام پر دیکھتی تھی۔ وہ دیکھتے تھے کہ صدیوں کی غلامی سے قوم ہلاکت و تباہی کے جس جہنم میں گرفتار ہے، قوم کے نوجوان بھی اس کے مہلک جراثیم سے محفوظ نہیں ہیں۔ جوانی کے پیمانے دن اور سال نہیں بلکہ کشمکشِ حیات میں عزم و استقامت سے سینہ سپر ہونے کی ہمت ہے۔ وہ دیکھتے تھے کہ اس معیار کے مطابق قوم کے

سے تو منہ جوان بھی پیران تن سال سے کچھ بہتر نہیں ہیں اس لئے وہ ان کی غایت کوشی اور سہل انگاری پر خون کے آنسو روتے تھے۔ وہ ان نرم و نازک پیکرانِ آب و گل کی طرف نہایت حسرت آمیز نگاہ سے دیکھتے اور سرد آہ بھر کر کہتے کہ

تیرے سونے میں افرنگی تیرے تن میں ہے پرانی
ہو تجھ کو دل کی شادی سے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

ان کے نزدیک ان امتِ قوم کے مستقبل کے آئینہ دار تھے لیکن ان کی کیفیت یہ تھی کہ ان کے قلوب دولتِ یقین سے تہی مایہ، ان کی نگاہیں نورِ بصیرت سے محروم، ان کے بازو قوتِ عمل سے بیگانہ اور ان کے دماغ تحقیقِ مقاصد کی متاعِ گراں مایہ سے عاری تھے۔

نہ کوئی زندگی سے مقصد ان کے افکار پر استیلا، نہ کوئی متعین نصب العین ان کے جذبات کی ان وادیوں میں مصروفِ جادہ پیمائی، کبھی میلانِ طبیعت کے ان صحراؤں میں مشغولِ انجمن آرائی۔ زندگی کے حقائق سے چشم پوشی اور مسرت کے ایک سے دیوانہ پن۔

ان کی یہ تادیب، ایک طبیبِ شفیق کی تشخیص تھی، فیصلہ عدالت کی تعزیر۔ ان کا نالہ ایک تنبیہ، ایک بے رحم خورد کی نوک نشتر تھی۔ ذہن کے ان سنگلاخ زمینوں کو نرم آلودہ نہ تھی۔ ان کی تنبیہ میں نفرت تھی نہ تحول نہ تھی۔ درد بن کر ان کے دل کی جراحت سے پھوٹ رہے تھے، خود اپنے عیب پر برہم، یہ تہ آلودہ تھا

غصہ سے لال پیلی نہیں ہو رہی تھیں بلکہ دل کا خون تھا جو شدت غم سے آنکھوں
کھنچ آیا تھا۔ وہ انہیں دیکھتے تھے تو راتوں کی تنہائیوں میں اُٹھ اُٹھ کر روتے
اور سسکیاں لے لے کر کہتے تھے کہ

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

لیکن انھوں نے اس لٹی ہوئی متاع کی فقط مرثیہ خوانی نہیں کی بلکہ یہ بھی بتا
کہ یہ لٹی کیسے! جب تک یہ نہ بتا دیا جاتا اس کے تحفظ و بقا کا انتظام کیسے کیا
جا سکتا تھا؟

تاریخ انسانیت پر نگاہ ڈالئے۔ ایک مسلسل داستانِ صید و صیاد نظر آئے
ہر وہ شخص یا اشخاص کی جماعت جو کسی طرح قوت فراہم کر لیتی ہے۔ کمزور انسانوں
اپنی ہوس کام جوئی کا ذریعہ بناتی ہے۔ مختلف زمانوں میں اس قوت کے استعما
کے اسباب و ذرائع بدلتے رہے ہیں، روح ہمیشہ اور ہر جگہ وہی کارفرما رہی
ہے۔ عہدِ جاہلیت میں چونکہ انسان کی عقلِ حیلہ جو نے ابھی ایسی پرکاری نہیں
سیکھی تھی۔ اس لئے اس زمانہ کے اوزاروں اور ہتھیاروں کی طرح، محکوموں
پنجہ استبداد میں جکڑے رکھنے کے حربے بھی کھردرے اور کند ہوتے تھے
جنھیں ہر آنکھ مشہود اور ہر قلب محسوس کر سکتا تھا۔ لیکن جوں جوں انسانی عقل
مکر و حیل کی وضع و ساخت میں ترقی کرتی گئی، آلات و ادواتِ حرب و ضرب
طرح، مغلوب قوموں کو ضعیفی و زبردستی کی نیند میں سلائے رکھنے کے اسباب

ذرائع بھی لطیف و غیر محسوس ہوتے چلے گئے ان تمام ذرائع میں، تعلیم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ آپ جس قسم کی قوم بنانا چاہیں، ان کے بچوں کو اسی قسم کی تعلیم دیتے جائیے۔ بلا مزید سعی و کاوش، وہ قوم خود بخود آپ کے ذہنی سانچوں میں ڈھلتی جائے گی۔ اور یہ تبدیلی کچھ اس طرح غیر مرئی طور پر ظہور پذیر ہو جائے گی کہ اس قوم کو پتہ تک بھی نہ چلے گا کہ ہم میں کوئی تبدیلی پیدا کی جا رہی ہے۔ جب ہندوستان میں انگریز آیا ہے تو اس نے محسوس کر لیا کہ مسلمان ہی وہ قوم ہے جو اس کے تغلب و استبداد کے راستہ میں روڑا بن سکتی ہے۔ چنانچہ اس نے اس قوم کو اپنے مطلب کے مطابق بنانے کے لئے وہی غیر محسوس لیکن ہدف نسخہ استعمال کیا جس کا ہم نے اُوپر ذکر کیا ہے۔ اس نے اس قوم کا نظامِ تعلیم بدل دیا اور اس ایک تبدیلی سے تھوڑے سے عرصہ میں پوری کی پوری قوم بدل گئی۔

یہ تھی وہ قوم غالب کی سحر آفرینی جو قوم مسلم کی تبدیلیٔ احوال (بلکہ تبدیلیٔ فطرت) کا موجب بنی تھی اور اس کی پردہ کشائی اس مردِ مومن کے پیشِ نظر تھی۔ اس باب میں وہ فرماتے ہیں۔

اک مردِ فرنگی نے کہا اپنے پسر سے
منظر وہ طلب کر کہ تیری آنکھ نہ ہو سیر
بیچارے کے حق میں ہے یہی سب سے بڑا ظلم
تیرے پہ اگر فاش کریں قاعدۂ شیر
کے میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر
کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

وہ جب ان مدعیانِ علم و ہنر کو دیکھتا کہ ان جھوٹے لگوں کی مینا کاری نے ان کی نگاہوں میں کس قدر خیرگی پیدا کر رکھی ہے تو وہ ایک خفیف سی ہنسی کے ساتھ کہ جو در حقیقت اس کا خندۂ زخم پنہاں ہوتا تھا، ان سے کہتا کہ فریبِ باطل پر یہ ناز و فخر کس لئے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ

ترا وجود سراپا تجلّیٔ افرنگ
کہ تو وہاں کی عمارت گری کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے ہے خالی
فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر

(ادبی پریس رولسن روڈ کراچی)